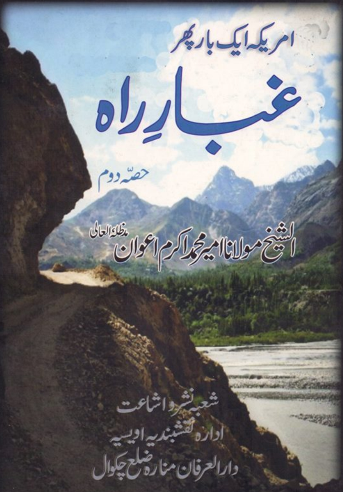

امریکہ ایک بار پھر

غبارِ راہ

حصہ دوم

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

شعبہ نشر و اشاعت
ادارہ نقشبندیہ اویسیہ
دار العرفان منارہ ضلع چکوال

امریکہ ایک بار پھر
سفرنامہ

غبارِ راہ

حصہ دوم

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

شعبہ نشر و اشاعت
ادارہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان، منارہ، ضلع چکوال

Phone: +92543562200 Fax: +92543562200
Email: darulirfan@gmail.com
Web Site: www.oursheikh.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

سفرنامہ: غبارِ راہ-دوم

مصنف: الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

قیمت: 150 روپے

شاعت اوّل: 1992ء

اشاعت پنجم: 2014ء

کمپوزنگ: نیشنل گرافکس اینڈ کمپوزنگ

پبلشرز: گڈلک پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر: صاحبزادہ ملک عبدالقدیر اعوان
ناظم اعلیٰ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان، منارہ، ضلع چکوال

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو وڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراسن سکیں۔ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ اپلیکیشن بھی موجود ہے
آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جاکر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ اپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کرسکتے ہیں۔

اس ویب سائیٹ اور اپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔

1-مفسّر، مترجّم ومفکّرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2-مشکوٰۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔ 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہی آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔4-اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبد الباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔5-حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6-ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8-اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔

9-سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریبا تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فورا اپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کرسکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کرسکتے ہیں۔ 03235205255

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

یہ ''غبارِ راہ'' کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ سفرنامہ دُنیا کے نامور ادبی رُوحانی، ہمہ جہت شخصیت، نابغۂ عصر روزگار ہستی الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہٗ العالی کی تصنیف ہے۔ یوں تو بہت سے افراد نے سفرنامے لکھے جن سے کتب خانے اور الماریاں بھری پڑی ہیں لیکن کم سفرنامے ایسے ہوتے ہیں جو کتب خانوں کی بجائے ذہنوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ شیخ المکرم مدظلہٗ العالی کا سفرنامہ نہ صرف ذہن میں محفوظ ہوتا ہے بلکہ دل میں اُتر جاتا ہے۔

شیخ المکرم مدظلہٗ العالی نے اپنی مصروف زندگی سے وقت نکال کر دُنیا کے اکثر سفر فرمائے۔ ان اسفار کی باقاعدہ روداد شائع فرمائی۔ جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ زیرِ نظر سفر کا مطالعہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس تمام کے علی الرغم اپنے مقبول بندے سے کام لے کر شرق و غرب میں پھیلے انسانوں کے دلوں میں نُورِ ایمان کی ایک لہر پیدا فرما دی۔

کائنات میں پھیلے قدرت کے عجائبات ملاحظہ کرنے کے لیے سفر لازمی ہے۔ اس سے جہاں لوگوں کے حالات و واقعات سے آگاہی ہوتی ہے وہاں اُن کے طرزِ معاشرت و تمدن سے واقفیت بھی حاصل ہوتی ہے۔

عجائبات قدرت کے نظارے سے معرفتِ پروردگار نصیب ہوتی ہے کہ ہر موضوع اپنے صانع کا پتا دیتی ہے۔ عالم سارا اُسی ایک اللہ کی معرفت کا پتا بتارہا ہے۔ یہ

ایک مسلمہ بات ہے کہ السفر وسیلة الظفر سفر کامیابی کی کنجی ہے۔اس جملے میں ایک جہاں آباد ہے۔ بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں۔مسافرانِ راہِ وفا نے زمین کے مختلف حصوں کے سفر کیے۔اسی قافلے کی ایک شخصیت الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی نے بھی دُنیا کے مختلف ممالک میں قدم رنجہ فرمایا۔ بندگانِ خدا سے ملے، اُن کے قلوب کو ذِکر اللہ سے منور فرمایا، ان کو صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ دیا۔یوں شیخ المکرم مدظلہ العالی کے سفرنامے ''غبارِ راہ'' کی نوعیت حقائق و معارف کے لحاظ سے باقی سفرناموں سے مختلف ہوگئی۔

سفر کی برکات کا کون انکار کرسکتا ہے۔نبیٔ اکرم ﷺ نے سربلندیٔ اسلام اور تبلیغ واشاعتِ دین کے لیے بے شمار سفر فرمائے۔جن کی تفصیل علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ کی تصنیف ''الوفا باحوالِ مصطفیٰ ﷺ'' میں پڑھی جاسکتی ہے۔شیخ المکرم مدظلہ العالی نے اسی سنتِ مطہرہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ''رب کی دھرتی رب کا نظام'' کی جدوجہد میں پوری دُنیا کے سفر فرمائے۔عظیم ہستیوں کے امین شیخ المکرم مدظلہ العالی کے اس سفر کا مطالعہ آپ کو مختلف کیفیات اور وارداتِ قلبی سے دوچار کردے گا۔ان شاء اللہ۔اگر یہ چیز نصیب ہوگئی تو سفرنامہ پڑھنے کا مقصد حاصل ہوگیا۔اگر مطالعہ کے دوران میں اپنے آپ کو تصور میں شریکِ سفر بھی کرلیں تو بے حد لطف آئے گا اور لفظ لفظ دل کی گہرائی میں اُترتا جائے گا۔

''غبارِ راہ'' دینی معلومات اور علوم و معارف کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔اس کی زبان سادہ مگر پُروقار ہے۔جملوں میں بے ساختگی خطوطِ غالب کی یاد دلاتی ہے۔

مثلاً ایک فقرہ ''غبارِ راہ'' سے:

''پھر سے بھیگ اُٹھایا اور ہم راہ نورد شوق ہوئے، غرب سے لوٹے تھے شرق کو چل دیئے۔''

اس سفر میں شیخ المکرم مدظلہ العالی نے عالمِ اسلام کو درپیش موجودہ صورت حال پر مؤثر خطابات فرمائے جو کہ سفرنامے کی جان ہیں۔ان خطابات میں عالمِ کفر کی جانب

سے درپیش چیلنجوں پر مکمل اظہار خیال فرمایا اور مسلمانوں کے لیے درست لائحہ عمل تجویز فرمایا کہ اللہ کو دلوں میں بسالو، تمہارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ خدا بیزار معاشروں میں یہ آوازِ نسیمِ صبح کے جھونکوں سے کم نہ تھی۔ سعید رُوحوں نے لپک کر لبیک کہا اور دل کی بنجر زمین آباد کر لی۔ اور یہ سلسلہ دورانِ سفر ہوائی جہاز میں بھی جاری رہا۔ جہاں جہاز کے عملے اور فضائی میزبان خواتین نے بھی قلبی ذکر کی دولت حاصل کی۔

آج اُمتِ مسلمہ استعماری قوتوں کے ہاتھوں زخمی ہے اور ان زخموں سے رِستے ہوئے خون کو دیکھ کر دل اگرچہ افسردہ ہے مگر رونے اور کفِ افسوس ملنے سے مسائل کہاں حل ہوتے ہیں۔ ان کے لئے تدبیر اور لائحہ عمل بنانا ہوتا ہے۔ سو، آپ کو ''غبارِراہ'' میں تدبیر کی یہ روشنی ضرور ملے گی۔ جس سے زندگی کی تاریک راہوں میں اُجالا ہو گا۔ سچی اور کھری بات تو یہ ہے کہ موجودہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ایمان شکن ماحول میں شیخ المکرم مدظلہ العالی کا وجودِ مسعود ہمارے لیے ایک حوصلہ اور ڈھارس ہے۔ ''غبارِراہ'' کے مطالعے سے اصلاحِ اُمت کا جذبہ، دعوت اِلی اللہ اور تزکیہ نفس کا درس ملتا ہے۔

میں اپنی معروضات کو ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

کس طرح شیخ المکرم مدظلہ العالی نے دورانِ سفر نظر آنے والے زمینی نظاروں کی منظر کشی کی، پڑھتے جائیے اور سر دُھنیے!

''جیسے ہی جہاز اُڑا تو پہاڑی علاقے شروع ہوئے اور زمین پر جمے ہوئے پانی ایسے لگتے جیسے کھیتوں میں کلر ہو، مگر تھوڑی دیر بعد منجمد ندی نالے نظر آنے لگے اور آہستہ آہستہ برف پہاڑوں پہ دکھائی دینے لگی۔ ایک بہت لمبا دریا جم کر چاندی ہو گیا تھا، ایک وسیع جھیل ڈوبتے ہوئے سورج میں ایسے لگ رہی تھی جیسے کسی نے بہت بڑی چاندی بچھادی ہو۔ آہستہ آہستہ تاریکی اپنا دامن پھیلانے لگی مگر جہاز ایک خاص علاقے پر سے گزرتے ہوئے وہاں کے نظارے دکھا رہا تھا۔ عجب بہار تھی، پہاڑوں پر برف شفق کے رنگوں میں

آتشبازی کے منظر پیش کر رہی تھی اور نیچے وادیاں سبز درختوں سے بھری تھیں۔ غالباً سردیوں کے پھل دار درخت لگے تھے اور یہ حسنِ فطرت کی آخری جھلک تھی جس نے آنکھوں کی راہ دِل تک خوبصورت اور احساسات کی بارش کر دی تھی۔ اور پھر فطرت نے لجاتے شرماتے ہوئے شفق تک کے رنگوں کو بادلوں تلے ڈھانپ دیا اور آخر رات کے دبیز پردے ہر شئے پر چھا گئے۔" (غبارِ راہ۔دوم: ص:123)

قصہ مختصر! شیخ المکرم مدظلہ العالی کے سفر نامے پر لکھوں تو کہاں تک!

؎ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ باری تعالیٰ حضرت شیخ المکرم مدظلہ العالی کا سایۂ عاطفت تا دیر ہم پر سلامت با کرامت رکھے تا کہ ہم حضرت شیخ المکرم مدظلہ العالی کی علمی، رُوحانی ضیا پاشیوں سے استفادہ کر سکیں ...

ایں دُعا از من و جملہ جہاں آمین آباد

پروفیسر افتخار احمد ملک ... راولپنڈی

امریکہ ایک بار پھر

یکم جون 1991ء:

صبح لاہور سے روانہ ہوئے اور ظہر کے وقت نیویارک میں تھے۔ اگرچہ جہاز مسلسل 18- گھنٹے اُڑتا رہا، سوائے اس کے کہ چند لمحے فرینکفرٹ میں زمین پر اُترا مگر اس کے باوجود نیویارک میں دن کے اڑھائی بج رہے تھے، اگرچہ اس وقت پاکستان میں رات کے ساڑھے گیارہ ہوں گے۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ ادھر آتے وقت ایک ہی دن دو دنوں کے برابر ہو جاتا ہے جبکہ یہاں سے واپسی اگر براہ راست ہو تو ایک دن کھو جاتا ہے۔ بہر حال پروگرام کچھ اس طرح سے تھا کہ 23 مئی کو اسلام آباد سے دوبئی، اور دو دن بعد وہاں سے لندن، اور دو یا تین روز وہاں ٹھہر کر پھر نیویارک پہنچ جائیں گے۔ اگرچہ لندن دو ہفتے گزارنے کے بعد 4 مئی کو ہی پاکستان واپسی ہوئی تھی مگر ایک تو وہاں کچھ نئے احباب کو تھوڑی سی مزید توجہ کی ضرورت تھی اور دوسرے طویل سفر سے بچنا بھی مقصود تھا۔ اسی طرح میں دوبئی اور ابوظہبی بھی گزشتہ آٹھ نو ماہ سے نہ جا سکا تھا جبکہ وہاں بھی حاضری کی ضرورت تھی۔ مگر ہوا یہ کہ میرا امریکہ کا ویزہ اسی سال مارچ میں ختم ہو گیا تھا چنانچہ برطانیہ سے واپسی پہ میں نے اپنا پاسپورٹ راولپنڈی میں احباب کے سپرد کر دیا کہ امریکی سفارتخانہ سے ویزہ حاصل کریں۔

کچھ تاخیر تو ان کے بدلتے ہوئے ویزا قوانین اور احباب کی سستی کے باعث ہوئی، مگر اصل نقصان احباب کی سستی کے باعث ہوا کہ جب 22 مئی کو پنڈی پہنچا تو بتایا گیا کہ امریکی سفارتخانے نے 4 روز کے لیے ویزہ کا کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ ہمارا دوبئی کا ویزہ ایئرپورٹ پر آ چکا تھا مگر پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے جا نہ سکتے تھے لہٰذا دوسرے روز واپس ہو گئے۔ تیسرے دن پتا چلا کہ ویزہ تو لگ گیا تھا ہوا یہ کہ احباب اگر ذاتی طور پر

سفارتخانہ جاتے تو سفارتخانے سے پاسپورٹ لے آتے کہ اس پر تو ویزہ لگ چکا تھا، مگر انہوں نے محض فون کر کے پتا کیا اور سفارتخانے سے جواب دینے والے نے بتایا کہ چار روز کام نہ ہوگا۔ بھلا اسے کیا ضرورت تھی کہ تلاش کرتا اور بتاتا کہ آپ کا ویزہ لگ چکا ہے۔ تیسرے روز جب رسید لے جا کر پتا کیا تو پاسپورٹ لے آئے مگر تب اس قدر دیر ہو چکی تھی کہ نہ دوبئی جا سکے اور نہ ہی برطانیہ۔ اگر چہ وقت تھا مگر برطانیہ کے لیے کوئی پرواز نہ تھی اور حکومت کا قانون ملکی ہوائی کمپنی کے علاوہ دوسری کسی پرواز پر سال میں دوسری بار سفر کرنے سے مانع تھا۔ اگر چہ ہم دوسری پروازوں سے پہنچ سکتے تھے مگر ہمارا مجرموں کے مقابل بے بس قانون شرفاء کا راستہ روکنے کی پوری قوت رکھتا ہے اور یوں ہم مجبور تھے کہ اب 31 مئی کو نیو یارک کی ڈائریکٹ پرواز ہی کو لیں۔ اگر چہ احباب نے کہہ دیا کہ دوبئی اور برطانیہ جانا اللہ کریم کو منظور نہ تھا مگر یہاں یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مسلمانوں نے بحیثیت قوم یہ بہانا اپنا رکھا ہے کہ اپنی کوتاہیوں کو ''اللہ کی مرضی'' کے نام کا خوبصورت غلاف پہنا دیتے ہیں۔ اگر چہ یہ بات حق ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر ذرہ تک حرکت نہیں کرتا مگر انسان اپنی پوری کوشش، پورے خلوص سے کرنے کا مکلف اور ذمہ دار ہے۔ پھر کام نہ ہو سکے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے پوری ہمت اور کوشش کی مگر اللہ کو منظور نہ تھا، مگر سستی کر کے اس پر پردہ ڈالنا مناسب نہیں بلکہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ شیطان ہمیں وہاں حاضری سے روکنے میں کامیاب رہا اور احباب سے تھوڑی سستی کروا کے اس نے اپنا کام کر دکھایا۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے اور آئندہ اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق بخشے ... آمین ...

شمالی افغانستان کا منظر

31 مئی 1991ء کو 5:40 پر صبح صبح جہاز کو اُڑنا تھا جو اُڑتے ہوئے اودیسہ سوسائٹی کے اوپر سے گزرا اور ہم نے پہلی بار ہوا سے اپنے گھروں کو خوبصورت انداز میں دیکھا۔ پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے کہ رات دو بجے سے جاگے ہوئے تھے اور رات کو 12 بجے سے پہلے تو کبھی سونا نہیں ہوتا اور جہاز بھی لوریاں دے رہا تھا۔ لہٰذا ہمیں تب ہوش آیا جب ناشتہ دینے کے لیے بیدار کیا گیا۔ اس وقت صبح کے 7 بج رہے تھے گویا جہاز گزشتہ سوا گھنٹے سے فضا میں تھا۔ آنکھ کھلتے ہی پہلا کام باہر جھانکنے کا تھا۔ نیچے کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ سنگلاخ چوٹیوں پر برف چمک رہی تھی جو بتدریج نیچی ہوتی جا رہی تھی اور اسی نسبت سے کم ہوتی جا رہی تھی، حتیٰ کہ محض چوٹیوں پر لکیروں کی صورت نظر آنے لگی۔ تنگ وادیوں کی ٹیڑھی میڑھی مگر سرسبز لکیریں نمودار ہوئیں جن کے دامن صرف گزوں کے حساب سے پھیلے ہوئے تھے اور جہاں ذرا سا کھلا مقام تھا وہاں صرف افغان طرز کے کچے گھروں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آتے تھے۔ یہ شمالی افغانستان کا علاقہ تھا۔ یہ وہی سنگلاخ پہاڑ تھے جنہیں ''سرخ آندھیوں'' نے تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش کی مگر اللہ کی شان کہ آج بھی وہ پہاڑ سلامت نظر آ رہے ہیں جبکہ سرخ طوفانوں کے جبڑے ٹوٹ چکے ہیں اور اب اللہ کی زمین کے وہ مقہور و مغضوب خطے جو گزشتہ پون صدی سے ان کی گرفت کا عذاب جھیل رہے تھے، اب ان کی ٹوٹی پھوٹی گرفت سے آزاد ہو رہے ہیں۔ وادیوں کے تنگ دامنوں میں ہریالی اور درختوں کے جھنڈ ان کچے مکانوں کے باسیوں کے عزم و ہمت پہ گواہی دے رہے تھے۔ ہمارا ناشتہ ختم ہونے تک، ایک بہت بڑے دریا کی صورت نمودار ہوئی۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ وہی مشہور دریائے آمو ہوگا جو روس اور افغانستان کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا ہے کہ جہاز کے کپتان کی آواز آئی کہ ''ہم پاکستان کی ہواؤں سے اُڑتے ہوئے افغانستان کے اوپر سے گزر رہے ہیں اور جلد ہی روس کی سرحد میں داخل ہوں گے۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے روس کی زمین پر پرواز کرتے ہوئے پولینڈ،

سویڈن اور جرمنی پر سے گزر کر ہالینڈ پہنچیں گے جہاں ایمسٹرڈیم کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اتریں گے''۔ اس اعلان نے یقین دلایا کہ یہ دریائے آمو ہی ہے۔ تب ہی دریائے آمو کا وہ مشہور پل نظر آیا جو روس اور کابل کے درمیان مشہور رابطہ اور گزرگاہ ہے جو روسی حملے سے سات سال پہلے نہ تھا، یہ پل 1972ء میں بنا تھا۔ کابل کی طرف پل کے پاس چھاؤنی نظر آرہی تھی، غالباً جس کے کچے مکانوں کی ترتیب بتا رہی تھی کہ یہ فوجی بارکیں ہیں۔ یہی وہ پل ہے جس نے روس کے ٹینکوں کو متکبرانہ انداز میں چنگھاڑتے ہوئے گزرتے دیکھا تھا اور پھر روس کے ٹوٹے پھوٹے ٹرکوں کو اپنے سپاہیوں کے کٹے پھٹے جسم لاد کر واپس جاتے بھی دیکھا۔ اگرچہ روسیوں نے نہتے مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کردی اور لاکھوں فرزندانِ توحید اپنے خاندانوں سمیت جامِ شہادت نوش کر گئے۔ معصوم بچوں کی کچلی ہوئی لاشوں نے زمین کا چہرہ داغ داغ کر دیا اور سنگلاخ چٹانوں پر جوان بچیوں کے بکھرے ہوئے جسم جنہیں روسی پکڑ کر ہیلی کاپٹر میں لے اُڑتے اور بے آبرو کرنے کے بعد فضا سے نیچے پھینک دیتے، روسیوں کی بربریت کی داستان کا حصہ بنتے رہے مگر کوئی بھی ظلم افغانوں کے جذبۂ آزادی کو جو اسلام کی حقیقی دین ہے، سرد نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ ظالم جو اپنے ظلم سے تو تھک نہ رہا تھا، مسلمان مجاہدین کے جذبۂ حریت سے شکست کھانے لگا اور مؤرخ نے روسیوں کی ماؤں کو افغان سرزمین پر رو رو کر اپنے ظالم بیٹوں کی زندگی کی بھیک مانگتے بھی دیکھا۔ یہ بوڑھا دریائے آمو جہاں ماضی کی بے شمار داستانوں کا امین ہے، اس تازہ افسانے کو کبھی نہیں بھولے گا، کبھی نہیں۔

ترکستان کا علاقہ

پل کے اس پار چھوٹی سی لمبوتری سی پہاڑی کے ساتھ روسی چھاؤنی ہے۔ جس پر ٹین کی چھتیں چمک کر اس کا پتہ دے رہی تھیں اور عین پل کے سرے سے پکی سڑک شروع ہو رہی تھی جو آگے کے وسیع اور اونچے نیچے علاقے کو مختلف سمتوں میں کاٹتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ اب اردگرد کئی شہر بھی نظر آنے لگے تھے اور عجیب بات ہے کہ تمام شہر جدید طرز پر بنے

ہوئے تھے۔ گھروں اور محلوں کی تقسیم اور شہروں کے اندر کی متوازی سڑکیں ایک دوسری کو کاٹتی نظر آتی تھیں۔ گھروں کی چھتیں اکثر چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ پھر آگے ویسی ہی تنگ وادیاں بھی نظر آتیں مگر ایک بڑا فرق یہ تھا کہ عموماً ہر وادی پر پانی کا ڈیم بنا ہوا تھا اور وادیوں کے دامن سرسبز تھے جن میں جہاں بھی جگہ ملی، خوبصورت گھر بنا لیے گئے تھے۔ شہروں اور گھروں کے اندر ہر وادی میں ڈیم اور پانی کا صحیح استعمال حکومت کی منصوبہ بندی کا پتا دے رہا تھا۔ اور ہاں! آپ کو مزے کی بات بتاؤں کہ لمبے سفر پر جہاز والے عموماً فلم دکھاتے ہیں جو ہماری پہنچ سے دور تھی کہ بیٹھنے کو جگہ ایسی ملی تھی جہاں سے فلم کی سکرین نظر نہیں آسکتی تھی۔ لہٰذا مختلف بینڈوں پر ریڈیو کے مختلف انداز کے گانے، قوالیاں اور غزلیں سنی جا سکتی تھیں، جن میں سے میں نے غزلوں کا انتخاب کیا تو یہ شعر گایا جا رہا تھا۔

نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے
چپ اگر رہتا ہوں دل غم سے پھٹا جاتا ہے

بہر حال آنکھیں باہر دیکھ رہی تھیں مگر کان نغمے سن رہے تھے کہ بینڈ تبدیل کیا تو قوالی سنائی دینے لگی۔ قوال اپنے مخصوص انداز میں دہرا رہے تھے۔ غالباً مجھے شعر درست یاد نہ رہا ہو، بہر حال کچھ ایسا ہی تھا۔

سبھی مسکرا رہے تھے قتل پر میرے
جانے کیا سوچ کے رویا قاتل تنہا

ہم بھی بینڈ پہ بینڈ تبدیل کرتے رہے اور گانے کی جدید فسادی دھنیں سننے کو ملیں کہ انگلیاں پھر سے غزل پر ٹھہریں تو یہ شعر سمع نواز ہوا۔

سنا ہے غیر کی محفل میں تم نہ جاؤ گے
کہو تو آج سجالوں غریب خانے کو

ادھر نیچے زمین کی شکلیں بہت تیزی سے بدل رہی تھیں اور جہاز کے نیچے مزید ڈھلوانی علاقہ نظر آ رہا تھا جس میں اب شہر نہیں بلکہ سمٹتی اور بل کھاتی دیواروں میں آبادی کٹ رہی تھی اور کھیت کم ہوتے جا رہے تھے۔ قوال اس شعر کی تکرار کر رہے تھے۔

دبا کے قبر میں سب چل دیئے دُعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

یورپ بادلوں کی اوٹ سے

اور تب ہم ایک وسیع چٹیل سے میدان پر پرواز کر رہے تھے جس میں ایک کچی چھتوں کا شہر نظر آیا اور پھر ایک وسیع غیر آباد علاقہ تھا جس کے خشک برساتی نالوں نے اسے عجیب سی صورت میں تقسیم کر دیا تھا جن میں سرخ رنگ کی خشک ریت چمک رہی تھی۔ گھڑی دیکھی، ساڑھے آٹھ بج رہے تھے یعنی ہمیں روس کی زمین پر اُڑتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چلا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ریتلے نالے بڑھتے جا رہے تھے پھر میدان نما وادیاں سی نظر آنے لگیں مگر یہ سارا علاقہ غیر آباد تھا اور ٹوٹی پھوٹی زمین زخموں سے چور سی نظر آتی تھی۔ گھنٹہ بھر بعد دیکھا تو منظر بدل چکا تھا اور یہاں وہاں وادیوں کے اوپر ڈیم نظر آنے لگے تھے۔ لمبے لمبے راستے اور سڑکیں دور دور بکھری شہری آبادیوں کی نشاندہی کرنے لگے تھے کہ دفعتاً زمین کا سینہ چیرتی ہوئی بل کھاتی لمبی سی سیاہ لکیر پر نظر پڑی یہ غالباً ریلوے لائن تھی جو ہم نے پہلی بار دیکھی اور خیال رہے کہ جہاز 35,000 فٹ کی بلندی پر اُڑ رہا تھا۔ بہر حال مجھے جو نظر آ رہا تھا آپ کو بھی دکھا رہا ہوں۔ اب ایک تبدیلی ہوئی کہ زمین نمکین سی نظر آنے لگی تھی اور جہاں جہاں جوہڑوں کی صورت جمع ہونے والا پانی خشک ہو چکا تھا، سفید نمک جما ہوا نظر آ رہا تھا۔ اگر کچھ پانی باقی تھا تو اس کے کناروں پہ سفید نمک جما ہوا تھا اور بہت دُور چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی تھیں۔ ایک عجیب بہاریوں دیکھنے کو ملی کہ سبزہ جہاں کہیں تھا، گہرا نیلا نظر آتا تھا اور پانی پیلا پیلا سا جبکہ زمین سرخ مٹی کی تھی۔ پھر شاید روس کی حدود ختم ہونے لگیں اور ہمارا جہاز یورپ کے سبزہ زاروں کے اوپر پہنچنے والا تھا کہ پہلی بار بادل نظر آ رہے تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ یورپ بادلوں کی سرزمین ہے اور وہاں کے باسی اخلاق کی جن بھی پستیوں میں ہوں، زمین کے خوبصورت ترین خطوں پہ بستے ہیں۔ نیچے اونچی نیچی سطح، زمین کے بیچوں بیچ سرسبز وادیاں ویرانوں میں سبز دھاریاں سی کھینچی رہتی

ہیں۔ اگرچہ جہاز بادلوں سے بہت اونچا تھا مگر آزاد منش مخلوق بھی ہر رنگ میں ملتی ہے۔ یہ ایک بادل بھی کوئی بہت آوارہ مزاج ہے کہ اس بلندی پر آ کر جہاز سے لپٹ رہا ہے اور جہاز جو کسی آغوش کے سکون کی پروا نہیں کر رہا، بہت جلد اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ مگر یہ کیا؟ ارے! یہ تو پھر آ گیا اور اب کے تو جہاز سے گویا لپٹ ہی گیا ہو۔ ہر طرف دودھیا سی روشنی یوں لپٹ رہی ہے گویا جہاز کسی روشن ٹیوب سے گزر رہا ہو۔ یہ وہی آوارہ منش بادل ہے جو سورج کی کرنوں سے خود کو منور کر کے بالکل ٹیوب لائٹ کا منبع لگ رہا ہے اور یہ خوبصورت منظر آج پہلی بار دیکھا اگرچہ سفر کرتے عمر بیت گئی۔ اور آخر یہ سحر بھی ٹوٹا۔ اب بادل بہت نیچے ہیں اور کہیں خوبصورت سبزہ زار اور کشادہ سڑکیں یورپ کا پتا دے رہی ہیں۔ اور لو دیکھو! وہ کوئی خوبصورت شہر بھی نظر پڑا۔ مگر یہ کیا؟ ہاں یہی ہوتا تھا کہ اب زمین کو بادلوں کی دبیز تہہ نے ڈھانپ لیا ہے۔ یورپ میں عموماً سورج کم ہی نظر آتا ہے یا پھر کوئی بادلوں سے اوپر جہاز میں اُڑ رہا ہو تو الگ بات ہے مگر پھر اسے زمین نظر نہیں آتی۔ جہاں کہیں سے بادل ہٹا ہوا ہے وہاں سے یورپ کے سبزہ زاروں اور خوبصورت درختوں پہ نظر پڑتی ہے۔

ایمسٹرڈیم کی جانب

وقت گزرتا رہا اور یوں کافی دیر بعد پھر باہر جھانکنے کے لیے شیشے کے سامنے سے پردہ ہٹایا تو گہرے نیلے پانیوں کے ایک طرف خشکی اور درمیان میں جزیرے سے نظر آئے جن کے درمیان چھوٹے چھوٹے خوبصورت جہاز رنگ برنگی تتلیوں کی مانند لگ رہے تھے جو بہت تیزی سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ادھر خشکی بعض اوقات ایک نوکِ سناں کی مانند سمندر کا جگر چیرتی ہوئی نظر آتی تھی جس پر شہر یوں سج رہے تھے گویا ہیرے جڑے ہوں۔ یہاں خالی اور بعض سبز کھیتوں کے درمیان پیلے کھیت بھی بہار دے رہے تھے، شاید کوئی فصل پک کر تیار ہوگی۔ پاکستانی وقت کے مطابق دن کا ایک بج رہا تھا اور جہاز میں کھانا بٹنے لگا جس میں تھوڑے سے نیم پختہ چاول، دو تین بوٹیاں، ننھی منھی سی برائے نام سلاد اور چند خوش خطیاں یعنی خوبصورت پیکیج میں ننھا مکھن، معصوم سا جام اور دانت صاف کرنے کا تنکا شامل تھا۔

اگرچہ بظاہر دانتوں میں پھنسنے والی تو کوئی شئے نہ تھی، ہاں! روٹی کی خانہ پُری ایک ٹیڑھی میڑھی سی چھوٹی ڈبل روٹی نما شے سے کی گئی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا، ہمارا اپنا نصیب تھا۔ بھلا اس میں جہاز والوں سے کیا گلہ، اور یوں باقی وقت کٹا۔ سوا دو بجے کے قریب جہاز بھیا کچھ نیچے نیچے سے ہونے لگے تو خیال ہوا کہ ہالینڈ پہنچ رہے ہیں۔ اور واقعی جہاز ان بادلوں میں گھس گیا، ابھی جن سے بہت اوپر اُڑ رہا تھا۔ اچانک بادلوں سے نکلا تو زمین کے قریب تھا اور ایک شاہراہ پر بنے ہوئے دروازوں کی چھت پر لکھا تھا FLY KLM تو پتا چلا کہ ایمسٹر ڈیم پہنچ گئے۔ ایئر ہوسٹس پٹیاں کسنے اور لینڈنگ کے لیے تیار رہنے کی ہدایت جاری کر رہی تھی۔ ساتھ میں یہ خبر بھی دی کہ یہاں درجہ حرارت 10 سینٹی گریڈ ہے یعنی جس قدر زیادہ سے زیادہ ٹھنڈ بہار سے یہاں سردیوں میں تھی تب ہی جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ اس قدر خوبصورت لینڈنگ کی گئی کہ پتا تک نہ چل سکا۔ پہلے اترنے والی سواریاں جا چکیں تو آگے جانے والے مسافروں کو بھی نیچے اترنے کی اجازت ملی اور ساتھ میں بتایا گیا کہ آپ صرف 20 منٹ کے لیے باہر جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑی عیاشی کا تصور یہ تھا کہ ٹانگیں سیدھی کریں گے اور نسبتاً کشادہ باتھ رومز میں سے ہو آئیں گے۔ جب غسل خانوں میں پہنچے تو کئی بزرگوں کو وضو کرتے دیکھ کر ظہر کا خیال آیا۔ لہٰذا ہم بھی وضو کرنے لگے۔ جب میں پاؤں دھو رہا تھا تو اچانک وقت کی طرف خیال گیا کہ یہ اڑھائی تو پاکستانی وقت کے مطابق بج رہے ہیں جبکہ ہم تو یہاں ہالینڈ میں ہیں اور یہاں کا وقت ساڑھے گیارہ صبح کے ہے لہٰذا کونسی نماز۔ بس وضو کر کے باہر آئے تو کئی بزرگوں کو سربسجود بھی پایا جو اپنی سادہ دلی سے پاکستانی وقت پر ایمسٹر ڈیم میں ظہر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ہم کچھ دیر ہوائی اڈے کی شیشے کی دیواروں والی عمارت میں گھومے پھرے اور ساڑھے بارہ بجے پھر جہاز میں بیٹھے تو خیال آیا کہ سمت قبلہ تو دیکھیں، قبلہ نما نکالا تو پتا چلا کہ جہاز کا رخ قبلہ سے الٹی طرف ہے۔ بہر حال جب جہاز ٹیکسی کر کے رن وے پر پہنچا تو جہاز کا رخ قبلہ کی سمت ہو گیا اور یوں دوڑتے ہوئے جہاز میں ظہر کا دوگانہ ادا کیا اگرچہ جہاز نیویارک بھی ظہر ہی کے وقت پہنچے گا، ان شاء اللہ۔ یہاں سے نیویارک تک غالباً ساڑھے تین ہزار میل سے زائد سفر سمندر کے اوپر ہے۔ لہٰذا شیشے بند کیے اور آرام

کی ٹھانی مگر تھوڑی ہی دیر بعد، ایک بار پھر کھانا ملنے لگا۔ بظاہر تو وقت وہی تھا مگر صرف گھڑی کے مطابق، ورنہ حقیقت میں تو یہ شام کے کھانے کا وقت تھا، اور کھانا نسبتاً بہتر تھا اور بہتر طریقہ سے پیش بھی کیا جارہا تھا کیونکہ جہاز کا وہ عملہ جو پاکستان سے سوار ہوا، بدل چکا تھا جو اپنی روایتی تابعداری کے ساتھ تھوڑی سی عملی سختی بھی رکھتا تھا۔ یہاں سے سوار ہونے والے پاکستانی عملے کے مزاج میں تھوڑی سی یورپین ظاہرداری زیادہ تھی۔ پھر چیزیں صحیح پکی ہوئی تھیں کہ ہزاروں برائیوں کے باوجود یورپ ان باتوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اور پھر ہم نے سونے کی ایکٹنگ شروع کردی کہ فلم پھر سے ہماری پہنچ سے باہر تھی، اور شاید واقعی میں سوگیا۔ پاکستان سے ہالینڈ تک جہاز عموماً شمال کو بڑھتا رہتا ہے، لہٰذا وقت کا فرق صرف تین گھنٹے تھا مگر یہاں سے اب مغرب کو زیادہ جائے گا۔ لہٰذا نیویارک کا وقت یہاں سے چھ گھنٹے اور پاکستان سے 9 گھنٹے پیچھے ہوگا اور نیویارک کے وقت کے مطابق غالباً اڑھائی بجے ہم وہاں ہونگے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ فی الحال تو سونے کا خیال ہے، باتیں بعد میں۔

محبت کے سفینے

کیا سونا اور کہاں کی نیند، بس یہ ضرور ہوا کہ کچھ دیر کے لیے ہم جہاز سے بھی غیر حاضر ہوگئے۔ مگر کب تک، آخر پھر شیشے کے سامنے سے موٹا پردہ ہٹایا تو نیچے خوبصورت منظر تھا اور سمندر کی اس سمت اکثر یہ خوبصورتی دیکھنے کو ملتی ہے کہ حدِ نگاہ تک گہرا نیلا سمندر جس کے سینے پر اٹھنے والی لہریں آپس میں الجھ الجھ جاتی ہیں اور ایک دوسری سے ٹکرا کر خوب جھاگ اُڑاتی ہیں۔ جہاز کی بلندی سے یہ سفید جھاگ چھوٹے بڑے ستاروں کی مانند لگتا ہے اور یوں نظر آتا ہے جیسے آسمان نیچے ہو، گہرا نیلا، ستاروں سے بھرا ہوا۔ جگہ جگہ چمکتے ہوئے ستارے جو بپھری موجوں سے بنا کرتے ہیں۔

تا آنکہ براعظم امریکہ قریب تر آجاتا ہے اور ویسے ہی چھوٹے بڑے جزیرے، یا خشکی کی بڑھتی ہوئی نوکیں سمندر کے سینے میں جن پر آبادیاں بھی ہوتی ہیں، اور چھوٹے خوبصورت جہاز اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے جو عموماً بہت تیزی سے اُڑتے ہیں اور سمندر پر

بننے والی جھاگ، ہوائی جہاز کی بلندی سے نظر آتی ہے۔ بھلا یہ کرتے کیا ہیں؟ اس کا پتا آپ کو ان کے ٹیلیویژن اشتہار دیکھ کر ملتا ہے جو اس طرح ہوتے ہیں۔

"Some time on the Sea under the Sky" The Love Boats.

یعنی دوست مل کر ان کے عرشے پہ ناچتے اور جہاز کے شراب خانے سے مے پیتے ہیں۔ انہیں ہمارے محترم قاضی حسین احمد کے کاروانِ محبت سے ملتا جلتا نام دیا گیا یعنی ''محبت کے سفینے''۔ لوگ ان پر اپنی یادوں کے لمحے محفوظ کرنے آتے ہیں، خوب دادِ عیش دیتے ہیں حتیٰ کہ شراب پی پی کر اگلنے لگتے ہیں۔ اپنے ایک عزیز جو کبھی یورپ دولت کمانے آئے تھے، انہی سفینوں سے قے صاف کرنے پہ ملازم ہوا کرتے تھے جس کا حال وہ بڑے درد سے سنایا کرتے۔ بہر حال اللہ نے انہیں اس لعنت سے نجات بخشی اور اب پاکستان میں دال ساگ کھا کر خوش ہوتے ہیں۔

نیویارک میں آمد

چلو جی چھوڑو! کیا قصہ لے بیٹھے۔ دیکھو! نیویارک آ گیا، بہت بڑا شہر جسے سمندر نے چار جزیروں میں بانٹ رکھا ہے۔ جہاز آہستہ آہستہ نیچے آتا ہوا زمین کو چھو گیا۔ بتایا گیا کہ یہاں درجہ حرارت 30 سینٹی گریڈ ہے یعنی رَج کے گرمی، اللہ کی شان ہم کتنے موسموں سے گزر گئے۔ پاکستان میں رات کے 11:15 اور یہاں دِن کے 2:15 ہیں۔ جہاز سے اُتر کر امیگریشن کے لیے لمبی اور نہ ختم ہونے والی قطاروں میں کھڑے ہو گئے جو ہر جہاز کی آمد پر بڑھتی رہتی ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باری آنے میں لگا۔ کاؤنٹر پر مقرر افسر نے بغیر کچھ پوچھے مہریں لگا دیں کہ اس کے علم میں اضافے کے لیے دُنیا کے بے شمار ممالک کے ویزے اور داخلے خارجے کی مہریں ہی کافی تھیں۔ سامان لیا اور باہر کو لپکے، سامان اٹھانے کی ریڑھی مشین سے حاصل کرنے کے لیے اس کے کھلے جبڑے میں دو ڈالر دینا پڑے جس میں سے آدھے ڈالر کا سکہ مشین نے واپس کر دیا کہ یہ لوگ لوٹتے بھی دیانتداری سے ہیں۔ اب یہی دیکھیے بھلا! ہوائی اڈے کی ریڑھی کا بھی ڈیڑھ ڈالر جو خود دھکیل کر لے جانا

پڑی۔ باہر احباب منتظر تھے اور عجیب بات کہ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ اللہ کریم کا احسان کہ درجہء حرارت مناسب ہو گیا۔ کاروں کے طوفان میں گاڑی کو آتے آتے بھی دیر لگی اور پھر مکان چونکہ قریب تھا، اس لیے موٹروں کے طوفان میں گھسٹتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ گئے۔ گھنٹہ بھر سونے کو مل گیا اور پھر عصر پڑھی۔ بہت سے احباب منتظر تھے۔ ملاقات، باتیں، مغرب اور ذکر کے بعد کھانے تک رات کے 12 بج چکے تھے۔ الحمدللہ! یہ محض اللہ کریم کی دی ہوئی ہمت ہے، ورنہ اس قدر تھکا دینے والے سفر کے بعد اتنا کم آرام اور پھر کوئی دشواری محسوس نہ ہو، یہ سب کچھ آسان نہیں۔

1-6-1991:

نیویارک پہنچنے پر مقامی احباب تو جمع ہو ہی گئے، باہر کے دوستوں کے ٹیلیفون بھی مسلسل آنے شروع ہو گئے کہ امریکہ بہت بڑا ملک ہے اور ملک کے اندر ہی اندر وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے، تو اس لحاظ سے سفر بھی لمبے ہیں۔ پھر زندگی اس قدر مصروف ہے کہ آنا جانا تو وقت مانگتا ہے، پھر اگر کوئی آئے گا تو اکیلا، جبکہ احباب کا خیال ہوتا ہے کہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے، اور اس طرح کے دلائل ہمیں ہی سفر کرانے کے لیے ہوتے ہیں۔ بہر حال اب طے ہوا ہے کہ صبح ہوائی جہاز سے کلیولینڈ چلیں گے۔ اور وہاں سے شام گاڑی کے ذریعے ڈیٹرائیٹ پہنچ جائیں گے۔ وہاں دو روز ٹھہر کر 5/6/91 کو ان شاء اللہ نیومیکسیکو جائیں گے اور اگلے پروگرام وہاں بیٹھ کر سوچیں گے۔ کینیڈا سے بھی مسلسل اصرار ہو رہا ہے، اللہ کرے وہاں جانا بھی ہو سکے۔ بہر حال اب تو رخصت ہوتے ہیں، پھر ملیں گے، ان شاء اللہ...

تزکیہ کی ضرورت

3-6-1991:

کل صبح نیویارک کے لگاڈیا ایئرپورٹ سے کانٹی نینٹل کی پرواز سے اُڑے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں کلیولینڈ پہنچ گئے جو ایک پرانا اور بہت بڑا شہر ہے اور سمندر جیسی بڑی جھیل اری کے کنارے واقع ہے۔ یہ وہی جھیل ہے جو نیاگرا کی آبشار بناتی ہے اور سینکڑوں میلوں میں پھیلتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر چیمہ ہوائی اڈے پر موجود تھے اور ان کا گھر بھی زیادہ دُور نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر کھانا کھایا۔ گھنٹہ بھر آرام کو مل گیا اور ظہر ادا کر کے ان کے ایک دوست ناظم صاحب کے ہاں جانا تھا جہاں انہوں نے کچھ لوگوں کو چائے پہ بلا رکھا تھا جس میں بیان بھی کرنا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے وہ کاغذ دیا جس پر انہوں نے بندہ کا تعارف اور ساتھ دعوت کا پروگرام لکھ رکھا تھا تو پتا چلا کہ لوگوں کو یہ جاننے کا شوق ہے کہ تصوف کیا ہے اور اس کی ضرورت کیا ہے؟ بہر حال وہاں پہنچے۔ کافی لوگ جمع تھے۔ ناظم صاحب کے بہت بڑے گھر کے نیچے بیس منٹ (basement) کافی کھلی بنی ہوئی تھی جس کے درمیان اوپر سے آنے والی سیڑھیوں کا زینہ تھا۔ ایک طرف خواتین بیٹھی تھیں کہ زینہ پردے کا کام بھی دے رہا تھا اور دوسری طرف مرد حضرات جمع تھے۔ لوگوں سے ملتے ملاتے اور بیان شروع کرنے تک چار بج گئے۔ بہر حال بندہ نے اس آیہ کریمہ سے بیان شروع کیا:

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ قوم میں انہیں میں سے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت فرماتا ہے اور ان کا تزکیہ فرماتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے بے شک وہ اس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے۔

یہ اس آیہ کریمہ کا مفہوم ہے، اب اس کی روشنی میں آج کے سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں کہ اولاً ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ وہی ہے جس نے اپنا رسول مبعوث فرمایا، گویا اللہ کی ذات اور اس کی صفات کو ماننے کے لیے اس کے رسول کی تعلیمات کی ضرورت ہے۔ اور صرف اللہ کا رسول (ﷺ) ہی اللہ کی ذات کے بارے اور اس کی جملہ صفات کے بارے

درست اور صحیح بات بتا سکتا ہے اور اسی بات پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے۔ اب قدرتِ باری کا مشاہدہ اس کے رسول ﷺ کے کمالات کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے کہ وہ بے مثل و بے مثال ذات، قدرت کاملہ کی مالک، کس قدر رحیم و کریم ہے کہ اس نے اپنا رسول ﷺ ان میں، یعنی بے علم لوگوں میں یا یوں کہہ لیجیے انسانی تہذیب سے ناآشنا لوگوں میں مبعوث فرمایا جو بحیثیت انسان تو اسی معاشرے کا ایک فرد ہے مگر اس کے کمالات کی عظمتوں کا یہ حال کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کے ذاتی کلام سے آشنا فرماتا ہے اور اس کی ذات کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ایک طرف انسانی معاشرے پستی کا شکار تھے۔ اگرچہ روئے زمین پر انسانی معاشرہ تباہی سے دوچار تھا، وہ قدیم ہندوستان کے باسی تھے یا وسط ایشیا کی اقوام، ایران کی بادشاہت تھی یا اقوام مغرب، قیصر کی حکومت تھی یا رومن ایمپائر، امریکہ کے وحشی تھے یا افریقہ کے آدم خور؟ ہر طرف ظلم و جور، فتنہ و فساد تھا مگر اس کے باوجود ہر جگہ حکومت نام کی شئے بھی تھی یا پھر کوئی قبائلی نظام رائج تھا۔ مگر جزیرہ نمائے عرب کے لوگ تو اصلی اُمّی یا ناخواندہ تھے کہ ان کے ہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی، نہ ہی مضبوطی۔ قبائلی نظام بلکہ طاقتور کا حکم قانون تھا اور اس کی پسند کمزور کی مجبوری۔ تو اس تباہ حال معاشرے کے لوگوں کو اس پستی سے اٹھا کر کہاں پہنچایا۔ بلندیوں کا یہ عالم کہ اللہ کا ذاتی کلام انہیں سنایا، گویا کہ

"کر دیا ہم سخن بندوں کو خدا سے تو نے"

اور صرف وہ دعوت پہنچا کر یا کلام سنا کر چھوڑ نہ دیا بلکہ ان کا تزکیہ فرمایا۔ تزکیہ سے مراد ظاہری صفائی یا نہلا دھلا کر صاف کرنا ہرگز نہیں بلکہ تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی اور نورِ قلبی ہے۔ چنانچہ جب ان کا تزکیہ فرمایا تو انہیں یہ قوت نصیب ہوئی کہ وہ کتاب اللہ اور اس کے معانی یا مفاہیم سمجھ سکیں یا یہ کہ ایسا جان لیں کہ وہ معانی ان کے دلوں میں اتر کر ان کا حال بن جائیں تو پھر انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ آپ ﷺ نے تزکیہ کیسے فرمایا؟ کیا ایمان لانے والوں کو کوئی خاص وظیفہ بتایا، یا چلہ کشی کروائی، یا کوئی اور خاص مجاہدہ کروایا گیا کہ عبادات نماز، روزہ وغیرہ جب فرض نہ ہوئی تھیں تو بھی آنے والے کا تزکیہ تو ہو گیا اور وہ کس درجہ کا ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ صحابیؓ

بن گئے کہ نبوت کے بعد بلند ترین درجہ صحابیت کا ہے۔ ایمان، عمل، ورع وتقویٰ، دیانت و امانت اور خشوع وخضوع ہر اعتبار سے انبیاء کے بعد افضل ترین انسان قرار پائے۔ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ ہر آنے والا بغیر اس تفریق کے کہ وہ مرد تھا یا خاتون، بچہ تھا یا بوڑھا، امیر، غریب اور پڑھا لکھا تھا یا بے علم، شرف صحابیت سے نوازا گیا کہ یہ وصف، تزکیہ کا بلند ترین مقام اور اعلیٰ ترین درجہ تھا، نیز اس کے لیے جو کام ہوا وہ صرف اتنا تھا کہ ایمان لانے کے بعد کسی نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا یا آپ ﷺ کی نگاہِ مبارک اس پر پڑی تو وہ صحابیؓ بن گیا۔ لیکن اگر کسی کو یہ شرف نصیب نہ ہوا تو اگر چہ وہ بے شمار کمالات حاصل کر سکا لیکن صحابیؓ نہ بن سکا۔ تو ثابت ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے وجودِ پاک میں ایک خاص برکت تھی، آپ کے قلب اطہر میں ایک خاص نور تھا جو ملاقات پر بندے کے دل میں منعکس ہو کر اسے صحابیؓ بنا دیتا اور صحابہ کا وصف یہ ارشاد ہوا کہ قرآن کریم میں جو ذکر کی کثرت کا ارشاد ہے، اس کی تعمیل ان پر یوں آسان ہوگئی کہ ان کا ہر جزوِ بدن ذاکر ہوگیا۔

ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:۲۳)

ترجمہ: کہ ان کے وجود، کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ذاکر ہو گئے۔

بعد ازاں عبادات فرض ہوئیں، جہاد فرض ہوا، قرآن مکمل ہوا۔ آپ ﷺ نے دُنیا سے پردہ فرمایا اور دین کو پھیلانے کا فریضہ ان حضرات کے سپرد ہوا جو صحابیت سے مشرف تھے۔ تو انہوں نے ثابت کر دیا کہ دل کا تزکیہ ہو جائے تو آدمی کے لیے نہ صرف دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے بلکہ وہ دُنیا میں بھی اور امورِ دُنیا میں بھی کامیاب رہتا ہے۔ جیسا کہ حکومت، سیاست اور کاروبارِ دُنیا میں بھی صحابہؓ نے مثالی کام کیا اور عجیب ترین بات ہے کہ تباہی کے غار میں گرتے ہوئے معاشرے کو پھر سے سنبھالا دے کر باکمال انصاف سے ایک مثالی معاشرہ بنا دیا، گویا تاریخ کا دھارا بدل دیا۔

تصوف کے مدعی اور اصل حقیقت

آپ ﷺ کے وصال کے بعد جیسے آپ ﷺ ہی کی نبوت باقی رہی ہے اور رہے گی، آپ ﷺ کا لایا ہوا دین، کتاب اور آپ ﷺ کے ارشادات محفوظ ہیں، ویسے ہی وہ نورِ قلب بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خدمت میں حاضر ہونے والے تابعی بنے اور تابعین کی خدمت میں بیٹھنے والے تبع تابعی کہلائے۔ اور پھر ان کی خدمت میں جنہوں نے عمریں صرف کر کے یہ کمال حاصل کیا اور آگے پہنچایا وہ صوفی کہلائے اور اس عمل کو تصوف کہا جانے لگا۔ چونکہ تبع تابعین کے بعد وہ قوت نہ رہی کہ ایک نگاہ میں کام ہو جائے تو لوگوں کو صحبتِ شیخ میں بہت وقت لگانا پڑا، پھر اس کے ساتھ اسم ذات کا ذکر کیا جانے لگا کہ اس کا حاصل اگر ذکرِ دوام تھا تو بیج ہی پھل بھی بنا کرتا ہے اور یوں یہ سلسلہ تاحال قائم ہے اور ان شاء اللہ جب تک دُنیا قائم ہے، قائم رہے گا۔ اب رہی یہ بات کہ اس نام پر بہت سے لوگوں نے دُنیاوی مفاد حاصل کیا اور دوسروں کی گمراہی کا باعث بنے تو یہ درست ہے۔ مگر جب لوگوں نے خدا ہونے کے جھوٹے دعوے کیے، نبوت کے جھوٹے دعوے کیے تو صوفی تو اس لحاظ سے بہت چھوٹا درجہ تھا، یقیناً اس کا دعویٰ بہت سے لوگوں نے آسانی سے کر لیا ہوگا۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں کہ اسے چھوڑ دیا جائے، اگر ایسا کیا جائے تو جھوٹوں کو تو خالی میدان ہاتھ آجائے گا۔ جیسے خدائی کے جھوٹے مدعی کا جواب اللہ کی عظمت کے بیان سے اور جھوٹے مدعی نبوت کو حقیقی نبیؐ کے کمالات بیان کر کے لاجواب کیا جا سکتا ہے، تصوف کے جھوٹے مدعیان کا علاج بھی یہی ہے کہ اس شئے کی اصل صورت کو عام کیا جائے تاکہ لوگوں کو کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔ تو یہ آج کی اس مختصری ملاقات پہ بیان ہو سکا۔ آیئے اب مل کر دُعا کریں کہ اللہ کریم ہمیں نہ صرف اس کی طلب عطا فرمائیں بلکہ اس کا حصول ہمارے لیے آسان بنائیں کہ ہم دین کی حقیقی لذت اور دو عالم میں اس کے پورے پورے فوائد سے مستفید ہو سکیں۔ کچھ احباب نے مزید تفصیل کے لیے سوالات بھی کیے اور یوں یہ اجتماع چائے کے دور پہ ختم ہوا۔

امریکہ کا گلبرگ (بلوم فیلڈ)

واپس ڈاکٹر صاحب کے گھر آئے اور عصر کی نماز ادا کر کے ڈیٹرائٹ (Detroit) کے لیے ان کی کار میں روانہ ہوئے۔ اگرچہ کافی تھکن بھی ہو رہی تھی، مگر جانا تھا۔ مغرب راستہ میں ادا کی اور رات کو 12:30 بجے وہاں پہنچ سکے۔ وہاں جاوید بٹ صاحب کے ہاں جانا تھا۔ نیک، صالح، ہنس مکھ، ملنسار اور کامیاب ترین تاجر اور خوبصورت نوجوان ہیں۔ ان کا گھر شہر سے پھر بیس میل کے لگ بھگ باہر Bloom Field میں ہے جس کا معنیٰ پاکستان میں گلبرگ کیا گیا ہے۔ یہ وہاں کی اعلیٰ سوسائٹی کے رہنے کا علاقہ ہے اور ہر طرف محلات ہی نظر آتے ہیں۔ اللہ کریم کا احسان ہے کہ ہمارے ایک عزیز کو بھی اس نے اس قابل بنایا کہ اپنے زورِ بازو سے کما کر یہاں کے اعلیٰ ترین امراء میں سے ہے۔ مرسڈیز، لنکن اور رولس رائس گاڑیاں اللہ نے سواری کو دی ہیں۔ ہم نے ان کی رولس رائس کی قیمت کا اندازہ کیا تو پاکستان میں اگر لے جائی جائے تو پونے دو کروڑ میں چھوٹے گی۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ کہ اللہ کریم کا ان پر یہ احسان بھی ہے کہ مثالی مسلمان نوجوان ہیں۔ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے۔ وہ منتظر تھے بلکہ ایک اور عزیز اعتماد احمد شکاگو سے وہاں آئے ہوئے تھے، مل کر کھانا کھایا اور عشاء پڑھ کر ذکر کی مجلس ہوئی اور آرام کیا۔ صبح کی مصروفیات میں ایک حد تک آرام کیا کہ بہت تھک چکے تھے اور کچھ لوگوں سے ملاقات تھی چنانچہ پچھلے پہر کی چائے پر جناب ڈاکٹر امتیاز احمد صاحب سے ملاقات ہوئی جو یہاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے علاوہ اسنا (ISNA) کے صدر بھی ہیں۔ اسنا (ISNA) امریکہ میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ مؤثر تنظیم شمار ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب عرصۂ دراز سے یہاں بستے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کی شہریت ہے۔ چنانچہ رہتے کینیڈا میں ہیں کہ وہاں نسبتاً انسان محفوظ رہ سکتا ہے اور کام امریکہ میں کرتے ہیں۔ بہت سے موضوعات پہ بات ہوئی جن میں زیادہ اہمیت پاکستان میں نفاذِ اسلام کے عمل کے بارے میں بات چیت کو تھی۔ اسی مجلس میں ڈاکٹر آسکر مع اہلیہ شریک ہوئے جو عیسائی ہیں اور مختلف

مذاہب کے لوگوں کو جمع کر کے اس بات میں کوشاں ہیں کہ جن باتوں میں سب مذاہب میں اتفاق ملے، کم از کم اس موضوع پر مل کر کام کیا جائے اور سیکولر ازم کا مقابلہ کیا جائے۔

بہر حال انہیں کھانا بھی وہیں کھانا تھا، سب نے مل کر دعوت اُڑائی جو کافی پُر تکلف تھی اور ہم مسجد کو روانہ ہو گئے کہ مغرب وہاں ادا کرنا تھی۔ مغرب کے ماحول کے عین مطابق چند لوگ تھے۔ امام صاحب خوبصورت، دراز قد نوجوان تھے اور چند نوجوان ساتھیوں کے ساتھ کچھ بزرگ بھی تھے۔ مغرب کی نماز ادا کی اور مختصر سا بیان ہوا، موضوع تھا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً...

مختصراً جو ذہن میں ہے عرض کرتا چلوں کہ اللہ کریم انسان سمیت ساری کائنات کا خالق ہے مگر دوسری تخلیق اور انسان میں فرق یہ ہے کہ ساری کائنات کو انسان کی خاطر اس کی ضروریات کی تکمیل کی خاطر اور اس کی خدمت کے لیے پیدا فرمایا۔ آج تک کائنات کے جس قدر اسرار کھل سکے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ ہر ستارہ اور ہر سیارہ، فضا اور ماحول، آسمان اور عرش سب زمین کی طرف متوجہ ہیں، اور اس پر مختلف طرح سے اثر انداز ہو کر اس چمن کو آراستہ کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ جبکہ جو کچھ اس سب عمل کا حاصل زمین پر ہے، وہ انسان کی خاطر ہے اور اس کی ضروریات کی تکمیل کر رہا ہے۔ یہاں ربِّ جلیل نے ایک بہت بڑا احسان بھی فرمایا اور ایک بڑا امتحان بھی ڈال دیا۔ احسان یہ ہے کہ انسان کو بے شمار ضروریات دیں اور کائنات کو بہت وسعت، تو اسے اس میں آوارہ و سرگرداں نہیں چھوڑا، بلکہ اس وسیع کائنات سے اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے بہت خوبصورت طریقے اور انداز سکھا دیئے۔ اور اس کام کو انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سپرد فرمایا کہ اللہ کا کلام سننے کے لیے جس باطنی پاکیزگی، لطافت اور قلبی نورانیت کی ضرورت تھی وہ جسے نصیب ہوئی، وہ نبی کہلایا اور یہ اتنی عظیم نعمت تھی کہ انسان اپنی محنت سے کبھی نہ پا سکتا۔ لہٰذا اللہ کریم نے خود اپنے بندے منتخب کر کے نبی بنا دیئے۔ اسی لیے زمین پر آنے والا پہلا انسان خود نبی تھا یعنی حضرت آدم علیہ السلام، پھر جوں جوں ان کی اولاد پھیلی، انسانی آبادی اور ماحول اور اس کی ضرورت کے مطابق اللہ کریم انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث فرماتے رہے، اور یوں انسان اپنے مقصد کو پانے کے

آسان اور درست راستوں سے واقف ہوتا رہا۔ امتحان یہ کہ جس نے اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھایا اور اللہ کی کائنات اور اس کی تخلیقات میں اپنی مرضی برتنا چاہی، وہ گستاخ ٹھہرا اور کافر کہلایا۔ چنانچہ دو عالم میں جلنا اس کا مقدر ہو گیا۔ اب انبیاء نے جب اللہ کی تعلیمات آگے پہنچائیں تو گو اس درجہ کی نورانیت ضروری نہ رہی جو نبوت کا خاصہ تھی مگر پھر بھی ان سے آگاہ ہونے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے قلبی نور کی ضرورت بدستور باقی رہی، جو انبیاؑ علیہم السلام نے تقسیم فرمایا اور ہر ایمان لانے والے کا تزکیہ فرمایا۔ یعنی اس کا قلب منور کر دیا کہ اللہ کے کلام کو سمجھ تو سکے، پھر عبادات فرض کی گئیں۔ مقصد یہی قلبی نور قائم رکھنا اور اسے بڑھاتے رہنا تھا۔ چنانچہ کفار جو نورِ قلب سے محروم رہے، اللہ کا کلام محض حکایات سمجھتے رہے اور اس کی معرفت و حقیقت سے بے خبر رہے۔ ایمان لانے والوں کو فائدہ حاصل کرنے کی سعادت تب ہی نصیب ہوئی جب انہیں نورِ قلبی نصیب ہوا۔ جس کا ادنیٰ درجہ بیشک ایمان لانا ہے مگر پھر نبی کے قلب کے نور سے قلب کو منور کرنا اور کرتے رہنا کمال کا راستہ ہے۔ چنانچہ جب حالات بدلے، اللہ نے نئی نبوت کے ساتھ نیا دین بھی بھیجنا چاہا تو پہلے کلام اور کتاب سے وہ نور اٹھا لیا گیا اور اس میں دلوں میں اترنے والی بات ختم کر دی گئی۔ اسی لیے ان انبیاؑ کی نبوت پر ایمان تو ضروری ٹھہرا مگر عمل کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ پھر وہ کتابیں بھی اپنی اصلی حالت پہ نہ رہ سکیں کہ کلام میں سے اعجاز کا نور تو اٹھ گیا تو لوگوں نے اس میں اپنی باتیں بھی شامل کر دیں۔ القصہ! جب انسانیت اپنے بلوغ کو پہنچی، حالات تبدیل ہوئے، انسانی ایجادات نے سب اولادِ آدم کو ایک کنبہ اور روئے زمین کو ایک گھر بنا دیا تو اللہ نے نبی بھی ایسا عظیم بھیجا جو بیک وقت ساری انسانیت کے لیے اللہ کا رسول مقرر ہوا اور اس کے قلب کا نور لازوال ٹھہرا یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانی قلوب کی حیات بن گیا۔ اس کی تعلیمات ناقابلِ منسوخ اور اس کا دین ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل ٹھہرا۔ چنانچہ اب اس دین کو نہ ماننا کفر ٹھہرا۔ اگرچہ پہلے کسی دین کو مانتا بھی رہا ہو کہ ان پر عمل ختم ہوا اور ان سے وہ نور اٹھا لیا گیا جس کے باعث عمل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے صحابہؓ کہلائے اور تمام

انسانیت سے افضل ٹھہرے کہ ان کے قلوب کو نورِ کامل نصیب ہوا۔آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی تعلیمات، آپ ﷺ کے نورِ قلب سمیت صحابہؓ نے آگے پہنچائیں، اور پھر اگلوں نے، اور آگے یوں سلسلہ تا حال جاری ہے اور ہمیشہ رہے گا۔مگر فرق درمیان میں یہ آن پڑا کہ مسلمانوں نے زبانی کلامی بات پر اپنی کوشش ختم کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین محض بات کی حد تک رہ گیا اور وہ جذبہ فنا ہو گیا جس نے خانہ بدوشوں کو روئے زمین کا سلطان بنا دیا تھا۔چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کفار کے لیے کھیل تماشا بن کر رہ گئی۔اب جبکہ وسائل مسلمانوں کے پاس ہیں، زمین کا زیادہ حصہ ان کے زیر نگیں، میدان، وادیاں، دریا اور پہاڑ ان کے پاس، معدنیات پر ان کا قبضہ اور دُنیا کی چھ(6) ارب آبادی میں ان کی تعداد دو (2) ارب ہے۔اس کے باوجود یہ دُنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔جو مساجد میں لگے وہیں رہ گئے، جو میدان میں اترے واپس مسجد نہ آسکے۔تو ضرورت ہے کہ آج پھر سے اس نورِ قلب کو تلاش کیا جائے جس کے باعث مسلمانوں کو نہ صرف معرفت باری نصیب ہوئی تھی بلکہ معاملاتِ دُنیا میں بھی انہیں کمال حاصل ہو گیا تھا۔سیاست، تجارت، اخلاقیات اور معاملات میں انہوں نے دُنیا کی قیادت کی۔اگر آج بھی وہ نورِ قلب نصیب ہو تو دین کا نہ صرف علم حاصل ہو بلکہ دین پر عمل بھی آسان ہو جائے، اور دُنیا کے کمالات خواہ علوم جدیدہ ہوں یا سیاسیاتِ عالم، ان کا حصول بھی سہل ہو جائے۔اللہ تعالیٰ ہمیں پھر سے وہ نورِ قلب نصیب فرمائے۔دیر سے واپسی ہوئی، نماز اور ذکر میں رات کے 12 بج گئے، چنانچہ آرام کیا۔

امریکی مسلمانوں کے مسائل

اگلا دِن شہر اور بازار دیکھتے گزرا۔چھوٹی چھوٹی چند چیزیں خریدنا تھیں۔جاوید صاحب کے ساتھ پھرتے رہے اور بہت بڑے شہر کے کچھ اس سرے اور ایک آدھ شئے دوسرے سرے سے ہاتھ آئی۔ڈیٹرائٹ امریکہ کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔غالباً 60 سے 80 میل تک لمبائی اور تقریباً 20 میل چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔دوپہر کا کھانا

ایک ہندوستانی ہوٹل ''شالیمار'' نامی میں کھایا جو یہاں بہت مشہور ہے۔ جہاں تک کھانے کا تعلق ہے بظاہر تو یقیناً بہت اچھا تھا مگر طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی اور دل پہ گھبراہٹ، سر میں درد نے خوب ستایا۔ ڈاکٹر زبیر راٹھور بھی آ گئے۔ رات کے بیان کا حاصل فی الحال تو یہی نوجوان ہے جو پھر ذکر کے لیے بھی آئے اور باقاعدہ ذکر شروع کیا۔ الحمد للہ! شام تھوڑی دیر آرام کر کے پھر کسی مشہور ہوٹل میں کھانا تھا۔ میں نے معذرت تو کی مگر جاوید نے اصرار کیا کہ چلو باتیں تو ہوں گی۔ ان کی اہلیہ بعض موضوعات پہ بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں چنانچہ ان کی رولس رائس پر بڑے طمطراق سے گئے۔ میں نے تو صرف کولڈ ڈرنک پی کر ساتھ دیا اور کھانے پر مسلم معاشرے میں ہندو رسومات پہ خاصی بات چیت رہی۔ امریکی ہونے کے باوجود ان کی سوچ بہت مثبت ہے اور یہ ہوتا بھی ہے۔ جو لوگ تحقیق کر کے اسلام قبول کرتے ہیں، ان کا اسلام کے ساتھ جذباتی لگاؤ ہوتا ہے اور وہ مثالی اسلامی معاشرہ دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ مگر ہم جو پیدائشی مسلمان ہیں، ہماری بات دوسری ہے۔ ہمارا شاید معاملہ نہ تحقیق کا ہے، اور نہ پسند کا۔ بس! ایک بات ہے جو گلے پڑ گئی اور یوں ہم نبھا نہیں رہے، گھسیٹ رہے ہیں۔ نیویارک میں ایک خاتون جس نے گزشتہ برس اسلام قبول کیا تھا، سے ملاقات ہوئی تو اس کا حال بھی مختلف نہ تھا۔ اگرچہ گزشتہ برس سے باقاعدہ ذکر بھی کر رہی ہے مگر مسلمانوں کا حال دیکھ کر کہہ رہی تھی کہ جب میں دیکھتی ہوں کہ میں جس معاشرے، عقیدے اور طرز زندگی کو چھوڑ کر اسلام کی طرف آئی ہوں، خود مسلمان اسلام کو پس پشت ڈال کر اس کافر معاشرے کی طرف بھاگ رہے ہیں، تو بہت پریشان ہوتی ہوں کہ مسلمان نہ حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں، نہ عبادت کی پروا، بلکہ اپنی ہر ادا کافرانہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ اور مسلمان حکمرانوں کو دیکھو تو ایک دوسرے کو باری باری کافروں سے پٹوانا اور ایک دوسرے کی گردن کاٹنا ہی ان کا وطیرہ بن چکا ہے۔ کسی مسلمان ملک میں اب امن و سکون نظر نہیں آتا، تو یہ سب کیا ہے؟ اب اس کا جواب صرف یہی دیا جا سکتا تھا کہ اس سب خرابی کے ذمہ دار ہم ہیں جو اسلام پر عمل نہیں کر رہے۔ اسلام اس کا ذمہ دار نہیں، وہ ان سب خرافات سے روکتا ہے۔ اب اگر لوگ صحیح

نہیں کر رہے تو آپ خود تو درست عمل کر کے ثابت کریں کہ اسلام قابلِ عمل اور انسانیت کا مذہب ہے اور یہ اللہ کا دین ہے۔ اگر اکیلا فرد بھی اس پر عمل کرے گا تو یقیناً فلاح پائے گا اور یوں ہم نے شرمندہ شرمندہ سا جواب دے کر مطمئن تو خیر کیا کرنا تھا، انہیں خاموش ضرور کرا دیا۔ اللہ ہم سب مسلمانوں کو بہتر مسلمان بننے کی توفیق دے۔

انسانوں کے شکاری:

صبح ڈیٹرائٹ سے کوچ کرنا ہے جو غالباً چوتھا بڑا شہر ہے اور یہاں بھی اندرونِ شہر وہی بدامنی ہے جو امریکہ کے سب بڑے شہروں کا خاصہ ہے۔ کالے بہت ہیں اور راہ گزرتے آدمی پر فائر کر دینا کوئی بات ہی نہیں۔ لوٹ مار، چوری اور نشہ آور اشیاء کا کاروبار ان کا پیشہ ہے۔ دراصل یہ ساری بدامنی صرف ان شہروں میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں کالے یعنی نسلاً افریقی بستے ہیں۔ اور غالباً سب کچھ حکومت امریکہ عملاً برداشت کرتی ہے مگر سیاہ فام لوگوں کو برائی سے روک کر ان کی اصلاح کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اور غالباً اس کی دو وجوہات ہیں: اوّل یہ کہ یہ لوگ انہوں نے شکار کر کے پکڑے۔ جی ہاں! ان امریکیوں کے بزرگ افریقہ میں انسانوں کو شکار کرتے، پھر انہیں جانوروں کی طرح جہاز میں لاد کر امریکہ لاتے اور بیچتے تھے، اور اب تک انہیں غلام ہی رکھا۔ غالباً کینیڈی پہلا امریکی صدر تھا جس نے کالوں کو گوروں کے ہوٹلوں اور کالجوں میں جانے کی اجازت دی، ورنہ اب تک یہ گوروں کی آبادی سے نہیں گزر سکتے تھے۔ اب یہ تو امریکہ برداشت کرنے سے رہا کہ یہ لوگ پڑھ لکھ کر اور سدھر کر انسان بن جائیں، اور کل کلاں کوئی سیاہ فام امریکہ کا صدر بنا ہوا ہو۔ پھر اس پر زیادتی یہ ہوئی کہ ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا جس کی بڑی وجہ غالباً اسلامی مساوات ہی بنی کہ گورا ہو یا کالا، مسلمان سب مسلمان ہی ہیں اور سب کا احترام بھی برابر ہے اور حقوق بھی۔ چنانچہ حکومتی ادارے کالوں کو مفت وظیفے دیتے ہیں، جرائم سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ بغیر والد کی اولاد پر بھی وظیفہ دیتے ہیں۔ انہیں ڈرگز (Drugs) سے روکنے کی کوئی مثبت کوشش نہیں ہوتی۔ یوں ان کی بہت بڑی اکثریت ہمیشہ جرائم کی دُنیا میں گم رہتی

ہے اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں بستی ہے۔ دور دراز چھوٹے شہروں میں یہ لوگ نظر نہیں آتے۔ شاید وظیفہ بھی نہ مل سکتا ہوگا اور جرائم کا موقع بھی۔ بہر حال یہ میرے اندازے ہیں۔ اصل بات کو اللہ کریم ہی جانتے ہیں۔

سان ڈیاگو: (San-Diego)

5- جون کو ڈیٹرائٹ سے ہمیں البقرقی (Albuquerque) کے لیے روانہ ہونا تھا جو مغربی حصے میں ہے، یعنی امریکہ کے مشرقی سرے سے مغربی سرے کو جانا تھا۔ ہماری پرواز 10:30 پر تھی مگر جاوید صاحب کو بھی لاس اینجلس جانا تھا۔ ان کی کاروباری مصروفیات تھیں جو انہوں نے ہماری خاطر کئی روز سے بند کر رکھی تھیں اور ان کی پرواز 9:20 پر تھی۔ لہٰذا ان کے ساتھ ہی ایئرپورٹ پہنچے جو ان کے گھر سے غالباً 30/25 میل ہوگا۔ وہاں انہیں الوداع کہا اور اندر گئے کہ جہاز کا پتا کریں کاؤنٹر پر بتایا گیا کہ آپ کا جہاز تو دو گھنٹے لیٹ ہے۔ بہت پریشان ہوئے کہ ہماری پرواز براہِ راست نہ تھی بلکہ ہم نے سینٹ لوئس سے جہاز تبدیل کرنا تھا جس نے ہمیں البقرقی پہنچانا تھا۔ جب انہیں یہ صورتحال بتائی تو کہنے لگے پھر ابھی بیس منٹ میں نارتھ ویسٹ کا جہاز جا رہا ہے آپ کو اس پر بٹھا دیتے ہیں تاکہ آپ کو اگلا جہاز مل سکے، ورنہ ہماری پرواز تو TWA کی تھی۔ چنانچہ بغیر کسی پریشانی کے ہم سینٹ لوئس پہنچ گئے جو تقریباً امریکہ کے عین درمیان میں ہے۔ بہت بڑا ہوائی اڈہ ہے اور ملک بھر میں ہر طرف پروازیں جاتی ہیں۔ عموماً لمبی پروازیں یہاں تبدیل ہوتی ہیں۔ بہت بڑا شہر ہے۔ ایک طرف سے ایک دریا شہر کو کاٹتا ہوا ہوائی اڈے کے قریب سے گزرتا ہے۔ ہوائی منظر بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اب ہمارے پاس وہاں بہت وقت تھا کہ ہم ڈیٹرائٹ جس قدر قبل از وقت آئے تھے، اتنے پہلے یہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ کافی پی، ہوائی اڈے کی وسیع عمارت میں پھرتے رہے اور خلق خدا کا ایک سیلاب دیکھتے رہے جو بڑا ہی عجیب و غریب طوفان سا ہوتا ہے۔

وہاں سے وقت پہ پرواز مل گئی۔ اور ہم امریکہ کے مغربی حصے کو روانہ ہوئے۔ مغرب

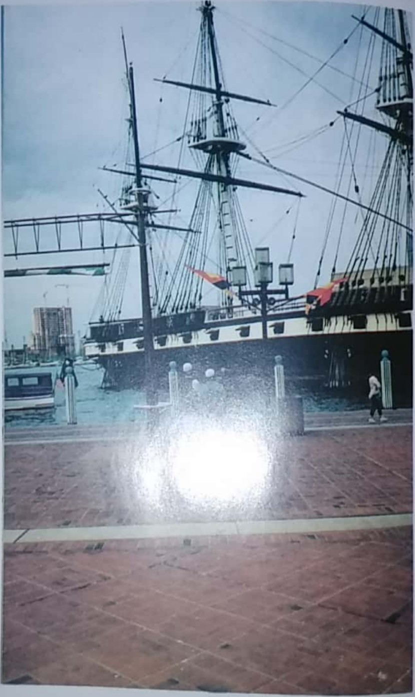

سینٹ ڈیاگو میں شپ یارڈ

میں صحرا بھی ہیں اور پہاڑی علاقہ بھی، اور ہر مقام کا اپنا حسن ہے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں یعنی نیو میکسیکو ریاست میں، اس کے اوپر ناواڈا کی ریاست ہے جس کے صحرا نہ صرف مشہور ہیں، بلکہ چاند پر جانے اور چاند سے زمین کے فوٹو لینے کا سارا ڈرامہ امریکیوں نے اسی جگہ پر رچا کر ایک مخلوق کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اس کے بارے میں کینیڈا کے اخبار نے فیچر چھاپا تھا، جس کا ترجمہ ہمارے ایک ملکی اخبار نے بھی شائع کیا۔ بہر حال کیا سچ ہے اور کیا نہیں، یہ تو اللہ ہی جانے! مگر مکاری اور فریب میں امریکن مجسم ابلیس ہیں، یا وہ یہاں پیدا ہوا ہوگا، یا ان کے خون میں بھی داخل ہے۔ یہ بات بڑی یقینی ہے مگر ان کے لیے جو انہیں سمجھ سکے ہوں۔ ان کے ہنستے مسکراتے چہروں کے پردوں میں چھپی ہوئی خباثت ہر آنکھ کو نظر نہیں آتی۔

موسم کی شدت:

ان علاقوں کی عجیب بات ہے کہ یہاں بگولے اٹھتے ہیں، جن کا موسم حال ہی میں گزرا۔ یعنی تقریباً مئی میں شمال سے برفانی ہوا آتی ہے اور جنوب سے صحرا کی گرم ہوا، تو وہ ان علاقوں میں ملتی ہیں اور بگولے پیدا کرتی ہیں جن کی لپیٹ میں اگر گاڑی آجائے تو یہ بگولے اسے میلوں دور جا پھینکتے ہیں۔ کار کی کیا حیثیت، دکان بھی زد میں آجائے تو اکھاڑ کر لے اُڑتے ہیں اور دو چار میل پرے جا پھینکتے ہیں۔ ان کے گھر ہماری طرح تو ہوتے نہیں، یہاں تو دیواریں بنی بنائی، دروازے، کھڑکیاں، تیار چھت بھی بازار سے مل جاتی ہے اور جوڑ کر گھر کھڑا کر لیتے ہیں۔ بہر حال بگولوں کی شدت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ جھاڑو کے تنکے اگر بگولے کی زد میں آکر اُڑیں تو درختوں کے تنوں سے پار ہو جاتے ہیں، اب ہوا کی رفتار اور قوت کا اندازہ کر لیجیے۔ نیز ان مغربی علاقوں میں آبادی بھی بہت کم ہے اور زیادہ تر پرانے اور اصلی امریکی رہتے ہیں جو ریڈ انڈین کہلاتے ہیں۔ بیچاروں کا برا حال ہے اور حیوانوں کی طرح زندگی کا بوجھ گھسیٹ رہے ہیں، جیسے کوئی مریل ٹٹو کسی ٹوٹی پھوٹی بگھی کو گھسیٹ رہا ہو۔ نہ وہ جوش اور ولولہ رہا جو ایامِ وحشت میں نصیب تھا اور نہ

دورِ حاضر کی تعلیم یا کوئی کمال ہاتھ آیا۔ مظلوم اور مسلسل ظلم کا نشانہ بن کر امریکہ کی جمہوریت نوازی اور انسانیت پروری کی داستان اپنے حال کی زبانی سناتے نظر آتے ہیں۔

ریڈ انڈین کے دیس میں:

جہاز خوبصورت پہاڑوں پر سے گزرا۔ دورانِ پرواز ہماری غذا آئی تو صرف سبزی، پیکٹوں میں بند کر کے اوپر ہمارے ناموں کے لیبل لگے تھے۔ چند تراشے گاجروں کے، پیاز، کھیرا اور سلاد، ایک معصوم سا ٹماٹر اور ایک بغیر گٹھلی کے زیتون اور بس۔ بڑا لطف رہا۔ اوپر سے کافی پی اور مختلف مناظر دیکھتے ہوئے ایک بہت بڑے پہاڑ کے دامن میں البقرقی اتر گئے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے تقریباً دو گھنٹے، وقت کا فرق پڑ چکا تھا۔ صبح 9:20 کے چلے ہوئے یہاں 2:40 پر پہنچے جو تقریباً ساڑھے سات گھنٹے بن جاتے ہیں۔ باہر آئے تو فاروق میاں منتظر تھے جو ہمارے عزیز اور پرانے ساتھی ہیں۔ چکوال سے ہیں اور آج کل ''سان ڈیاگو (San Diego) میں ہوتے ہیں۔ سامان لینے تک ڈاکٹر فاروق عبدالحق سابق ''رابرٹ ڈی کرین'' بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ دونوں کاروں میں سامان رکھا اور روانہ ہو لیے کہ ظہر شہر سے نکل کر پڑھ لیں گے، وضو ہوائی اڈے کی عمارت میں کر لیا تھا۔ شہر سے باہر چٹیل میدان، گہری سرخ مٹی جس میں بہت زیادہ کنکر تھے اور اس پر خود رو جھاڑیاں یا پھر سڑک۔ چنانچہ پندرہ بیس میل باہر نکل کر ویرانے میں نماز ادا کی۔ اور فاروق کی گاڑی میں دہی میں سلاد ملا ہوا اور ڈبل روٹی تھی جسے کار کے بونٹ پر سجا کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اگرچہ ہوا کی تندی نوالے چھین لینے کو تھی مگر کہاں جاتے، الحمدللہ! کہتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ سڑک تو مثالی بنائی گئی ہے مگر آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہاں! سڑک کے ساتھ اِکا دُکا گھر ہیں۔ کہیں پٹرول پمپ اور ساتھ کچھ آبادی۔ راستہ مسلسل اوپر کو اٹھتا جا رہا تھا چنانچہ 100 میل سفر کر کے سینٹا فی (Santa fe) پہنچ گئے جو اس ریاست کا دارالخلافہ بھی ہے اور البقرقی کے بعد دوسرا شہر۔ یہاں سے ہمیں دارالسلام جانا تھا جو ابکی (Albeque) میں واقع ہے اور یہاں سے پچاس میل ابھی اور آگے تھا۔ ادھر کو چلے تو کچھ پہاڑی اُترنا پڑی۔

جسے خوبصورت جنگل نے گھیر رکھا تھا۔ ٹیڑھی میڑھی چٹانیں اور ابھرتے ڈوبتے ٹیلے ریڈ انڈین کے علاقے کی نشاندہی کر رہے تھے جو ابھی تک ان علاقوں میں آباد ہیں۔ اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں مگر قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ یہ لوگ امریکہ کے اصل باشندے تھے مگر بہت زیادہ غیر مہذب اور جنگلی، ننگے رہنا اور پرندوں کے پروں کے تاج پہننا، منہ اور بدن کو مختلف رنگوں سے رنگنا، تیر کمان سے شکار کرنا، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری، یہ ان کے مشاغل تھے۔ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے کھاتے اور قبیلوں میں بٹ کر رہتے۔ ان پر اصل حکومت قبائلی سرداروں اور مذہبی لیڈروں کی تھی جو جادو ٹونا اور جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔

امریکہ کے اولین مسلمان:

یہاں پہلے مسلمان جو ہسپانیہ کی فتح کے بعد وہاں سے امریکہ کے جنوب مغربی علاقوں میں داخل ہوئے اور دور تک ملک کو فتح کرتے چلے گئے۔ ان مغربی ریاستوں میں بے شمار شہر اب بھی عربی ناموں پر ہیں اور بہت سے بدل دیئے گئے ہیں مگر ابھی تک یوم۔ البقرتی، المکی، المدنی، المکی اور اس طرح کے نام ہیں جنہیں بگاڑ کر امریکی لہجے میں بولا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ان علاقوں کو آباد کیا اور یہاں کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا جن کی نسل تاحال ملتی ہے۔ اگرچہ تعداد میں کم ہیں اور ہسپانیہ سے آنے والوں کی نسل بھی موجود ہے، بلکہ ان علاقوں میں ابھی تک گھروں اور شہروں کی طرزِ تعمیر ہسپانوی رنگ لیے ہے۔ اکثریت کی زبان ہسپانوی ہے جو سکولوں تک میں رائج ہے اور انگریزی یہاں دوسرے درجے کی زبان ہے۔ مگر جیسا کہ اسلام کا قانون ہے، مسلمانوں نے نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا، نہ ان کے مذہب میں دخل انداز ہوئے۔

مسلمانوں کے شکاری:

جب سپین میں مسلمانوں پر زوال آیا تو یہاں بھی عیسائی چڑھ دوڑے اور مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ ایک مشہور پستول ''کولٹ'' نامی ہے جو ان علاقوں میں کاؤ بوائز (Cow Boys) کا خاص ہتھیار شمار ہوتا تھا۔ وہ اس زمانے میں ایجاد ہوا تھا کہ مروجہ

پستول کی گولی مسلمان سپاہی کو روک نہ سکتی تھی اور گولی کھا کر بھی وہ مقابل کا سینہ شق کر کے گرتا تھا، جس پر یہ بہت طاقتور پستول بنایا گیا تھا کہ جس کی گولی لگنے پر وہ پھر اٹھ نہ سکے۔ اور یوں سپین کے ساتھ ان علاقوں سے بھی مسلمانوں کو قتل کر کے مٹا دیا گیا۔ جو خال خال بچ گئے، ان کی نسل تا حال باقی ہے۔ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے، یہ صدری تاریخ ہے جو ان بچ جانے والوں کے سینوں میں ان کے بزرگوں نے ڈالی تھی اور وہ اگلی نسل کو منتقل کر رہے ہیں۔ ورنہ ان بدمعاشوں نے جن میں اوّل انگریز تھے جو سب سے بڑے ظالم تھے اور بے دریغ قتل عام کر کے ان علاقوں پر چھا گئے، نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ مقامی باشندوں کو بھی جی بھر کے تہ تیغ کیا۔ اور پھر دو سو سال بعد ''امریکی'' آئے، جن میں کوئی بھی امریکہ کا رہنے والا نہیں۔ یہ وہ عیسائی تھے جو سپین اور سارے یورپ سے یہاں آتے رہے، انہیں یہودیوں نے یکجا کر کے انگریز کے خلاف کھڑا کر دیا اور یوں امریکہ آزاد ہوا اور امریکی قوم وجود میں آئی، جس نے قتل وغارت میں انگریز کے مظالم کو بھی شرمندہ کر دیا کہ یہ یورپ سے آنے والے سب جرائم پیشہ اور بھگوڑے تھے۔ یہاں وہ خود قانون تھے چنانچہ ان کے مظالم کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ مگر حد یہ ہے کہ تاریخ مسخ کر دی گئی، مسلمانوں کا نام ہی مٹا دیا۔ کولمبس کے سر امریکہ کی دریافت کا سہرا باندھا، حالانکہ مسلمان اس سے تین سو سال پہلے یہاں آ چکے تھے اور کولمبس گھر سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا جو سمندر میں دھکے کھاتا امریکہ کے ساحل سے آ لگا۔ اور یہاں کے لوگوں کو انڈین اسی نے کہا تھا کہ شاید میں ہندوستان پہنچ گیا ہوں اور یہ ہندوستانی ہیں۔ ذرا لیاقت ملاحظہ ہو کہ بالکل مخالف سمت جا پہنچا اور پروپیگنڈے کا کمال دیکھیں کہ تاریخ میں ہیرو شمار کیا جاتا ہے ''جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے''۔ بہر حال انگریز کو نکالنے والے یہودیوں، کے منظم کردہ نئے امریکیوں نے نہ صرف مسلمانوں کا صفایا کر دیا بلکہ مقامی لوگوں کو بھی ختم کر دیا، اور ان کے گاؤں کے گاؤں موت کی نیند سلا دیئے۔ صرف نمونے کے طور پوری امریکہ کی آبادی میں سے چند ہزار نفوس چھوڑے، جو اب ان علاقوں میں ہیں تو سہی مگر اب وہ بھی امریکن ہو چکے ہیں۔ لباس، حلیہ امریکی، چہرہ انڈین والا، نقش نگار میں ہنوز تیکھا پن ہے، مگر قبائلی غیرت کو

امریکن ایڈ کھا گئی اور بیچارے گداگر بن گئے۔ یہ امریکن ایڈ بھی عجیب خواب آور دوا ہے۔ یہ ان کا ''دھتورہ'' سمجھ لیجیے، جسے پلایا، اُسے آرام سے لوٹ لیا اور خبر بھی نہ ہونے دی۔ یہ جس کے دشمن ہوں، اس کو ایڈ دے کر مارتے ہیں۔ اب ریڈ انڈین اسی کے صدقے گداگر اور ''کالے'' (Black) چور بن چکے ہیں جن سے ان کو کوئی خطرہ نہیں۔ بہرحال ہم ایل بی کیو پہنچے جہاں دارالسلام کا خوبصورت سا ہوٹل ہے جس کا نام ایل بی کیو اِن (Albeque Inn) ہے۔ وہاں سے کچی سڑک پر مڑے اور کچھ دور جا کر پہاڑ کے دامن میں دریا کنارے چلتے ہوئے ان مکانات میں سے ایک میں پہنچے جو دارالسلام نے اپنے اساتذہ کے لیے کنارِ دریا تعمیر کیے تھے۔ جس میں ہمارا میزبان ڈاکٹر فاروق مقیم تھا۔ اور اب شام ہو رہی ہے، ان شاء اللہ باقی آئندہ۔ غالباً یہ سینٹ ڈیاگو (Saint Deigo) میں آخری تحریر ہو گی کہ فیض اور دوسرے کرنل صاحب کار سے جا چکے ہیں اور مجھے صبح جہاز سے ہوسٹن جانا ہے سو جب موقع ملا ان شاء اللہ حاضری ہو گی ... والسلام

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

دارالسلام امریکہ

ہوسٹن.... 14.6.1991:

جی! تو قصہ وہاں سے ہی شروع کریں جہاں چھوڑا تھا کہ یہ دارالسلام کیا تھا اور اب کیا ہے؟ اور یہ جناب ڈاکٹر فاروق عبدالحق کون ہیں؟ تو پہلے ڈاکٹر صاحب کے بارے سنیے کہ یہ ایک امریکی نومسلم ہیں، ان کا پہلا نام ڈاکٹر رابرٹ ڈی کرین (Dr. Robert D, Crain) تھا۔ اللہ نے توفیق دی تو مسلمان ہو گئے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی سفیر اور معاشی مشیر کی حیثیت سے کام کیا، پھر صدر ریگن کے مشیر رہے اور اب اسلام کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ گزشتہ برس دارالعرفان تشریف لے گئے، مہینہ بھر قیام کر کے واپس آئے تو انہوں نے دارالسلام دریافت کیا جو اس دور دراز جنگل میں ایک بہت خوبصورت جگہ ہے۔ آج سے دس برس قبل ایک عرب شہزادی نے کسی ہسپانوی سے ہزاروں ایکڑ رقبہ خریدا جو

تقریباً 15 مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف دریا بہتا ہے اور خوبصورت وادی ہے۔ دوسری طرف دور تک اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ دریا کنارے رہائشی مکانات، اور کوئی ایک کلومیٹر اوپر ایک میدانی سی جگہ۔ پر دارالسلام تعمیر کیا جس کے ساتھ بھی چار پانچ رہائشی مکان ہیں۔ بہت خوبصورت مسجد، ملحقہ عمارت میں پوری اکیڈمی ہے۔ شاندار زنانہ حصہ، آگے کلاس روم اور لیکچر ہال ہیں۔ بہت اعلیٰ قسم کے وضوخانے اور بے نظیر گیلریاں جو سب فرنشڈ (Furnished) ہیں اور ہر کمرہ، ہر ہال سجا سجایا ہے۔ عمارت اپنے طرزِ تعمیر میں انوکھی اور نرالی ہے۔ کچی اینٹوں کی دیواروں پر ایک خاص پلستر چڑھایا گیا ہے۔ لکڑی کا کام انتہائی قیمتی اور خوبصورت ہے۔ شاندار قمقمے اور بہترین شیشے لگے ہوئے ہیں۔ بجلی کا اہتمام اور گرم سرد پانی موجود ہے۔ ایک حصے میں بہت بڑی لائبریری ہے جس کے لیے شہزادی نے اسی (80) ہزار ڈالر خرچ کیے تھے اور عمارت کا خرچہ کروڑوں میں ہوگا۔ چنانچہ اکیڈمی شروع کی گئی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز بنا، جس کے لیے شہزادی نے بہت سا سرمایہ بنک میں ڈال دیا اور یوں سات برس تک کام گھسٹتا رہا کہ دراصل وہاں ویرانے میں اور تو کوئی کام ہے، نہ ذریعہ معاش کہ عام لوگ متوجہ ہوتے۔ لہٰذا صرف وہی لوگ آئے جو اکیڈمی سے معاشی طور پر منسلک تھے۔ مستری، کاریگر یا اساتذہ اور ایک چیف جو "شیخ" کہلایا۔ غالباً ان کا نام نورالدین درکاوی تھا جو شیخ ناظم نقشبندی درکاوی کے خلیفہ کہلاتے تھے۔ انہوں نے وہاں وہی تصوف اور ذکر کا طریقہ شروع کیا جو مسخ شدہ ہے اور جو اسلام کے لیے زہر قاتل بنا ہوا ہے، جس میں سنت سے دوری اور رسومات کی بھرمار ہے۔ چنانچہ شہزادی وہاں تشریف لائیں تو انہوں نے انہیں بھی ذکر کر کے بتایا جو مصری طرز کا ناچ کہہ لیں کہ کھڑے ہو کر زور زور سے گھومتے اور جھومتے بھی ہیں اور ذکر بھی کرتے ہیں۔ پھر کچھ لوگوں کو حال پڑا، جس کا ذکر ایک آدمی نے انگریزی میں یوں کیا کہ لوگ دیوانے ہو گئے (People Got Wild) تو شہزادی بہت بیزار ہوئیں۔ انہوں نے امداد روک دی اور یوں سارا سلسلہ رک گیا۔ شیخ بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ اس بات کو تین سال ہو چلے تھے۔ کچھ لوگ جو بورڈ کی طرف سے ذمہ دار تھے، وہاں تا حال مقیم ہیں، مسجد ویران اور عمارت

دار السلام کی خوبصورت عمارت جو اذان کی آواز تک سے محروم
غیر ملکی اور غیر مسلم سیاحوں کی تفریح گاہ

ڈاکٹر فاروق عبدالحق (ڈاکٹر رابرٹ ڈی کرین) کا گھر

دارالسلام کی طرف جاتے ہوئے

دارالسلام کی خوبصورت عمارت کی رہداریاں جو اذان کی آواز تک سے محروم ہیں
غیر ملکی اور غیر مسلم سیاحوں کی تفریح گاہ

بے آباد ہے۔ نیز اس علاقے میں عیسائی اور یہودی بھی مذہبی مراکز کھولے ہوئے ہیں کہ بہت پر فضا علاقہ ہے اور شہروں کے تھکے ہارے لوگ وہاں جانے اور چند دِن رہنے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ عمارت اس قدر عجیب ہے کہ دُنیا کے لوگ جو امریکہ میں ہیں، یا آتے ہیں، اسے دیکھنے چلے آتے ہیں۔ اب صورتحال یہ تھی کہ تین برس کی خجل خواری کے بعد بورڈ نے سوچنا شروع کر دیا کہ اسے بیچ دیا جائے اور یہودی گاہک بن گئے کہ ہم یہاں اپنی اکیڈمی بنائیں گے۔ وہاں جو ذمہ دار افراد ہیں، ان میں سے کسی کا رابطہ ڈاکٹر فاروق صاحب سے ہوا، یہ وہاں گئے (پاکستان سے آکر انہیں خبر ہوئی تھی)۔ یہ واشنگٹن ڈی سی سے جگہ دیکھنے گئے اور صاحب دل تھے، ویرانی برداشت نہ کر سکے اور وہیں کے ہو رہے۔ اپنا بوریا بستر لے کر وہاں جم گئے۔ ہمیں بھی لکھا تو اس سال امریکہ آنے کا بنیادی مقصد دارالسلام ہی تھا۔ چنانچہ وہاں اذان، نماز اور باقاعدہ بیان وغیرہ شروع کیا جس میں وہی لوگ تھے جو چند وہاں تھے۔ مگر پھر سے آبادی ہونے لگی حتیٰ کہ غیر مسلم بھی جو محض عمارت دیکھنے آتے تھے، انہیں ہم نے اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کرنا شروع کیں، جس میں لوگ بہت دلچسپی لیتے۔ ہدایت تو اللہ کریم کے ہاتھ میں ہے مگر کم از کم لوگوں کو کسی حد تک علم تو ہونے لگا، جنہوں نے پہلے یا تو اسلام کے بارے میں سنا ہی نہ تھا اور جو سنا، وہ غلط بھی تھا۔

بیت اللہ اور ہوائی جہاز:

وہاں جو امام مقرر تھے وہ ابھی تک وہاں تھے۔ لیبیا کے رہنے والے، مصر میں ہوائی فوج میں بحیثیت لڑاکا پائلٹ کام کرتے رہے۔ اسرائیل کے خلاف مصر کی مشہور جنگ میں شریک تھے۔ شادی امریکہ میں ایک امریکی مسلمان خاتون سے کی، جس سے دو بچے بھی تھے۔ پھر ذکر اذکار سیکھنے کا شوق آیا تو مروجہ صوفیوں کے قابو آ گئے، جنہوں نے یہاں بٹھا دیا کہ نماز پڑھایا کرو اور مستری کی دوکان پر لکڑی کا کام سیکھا کرو۔ بہت خوبصورت، تنومند اور پڑھا لکھا نوجوان یوں ضائع کر دیا۔ بیوی آخر کب تک ساتھ دیتی، بچے لے کر اپنی ماں کے پاس چلی گئی، شیخ خود بھاگ گئے، مگر یہ مردِ مسلمان وہاں ڈٹا ہوا تھا۔ اسے ذکر کا صحیح

طریقہ سکھایا اور اس کے فوائد بتائے کہ اس سے تو عملی زندگی اور بہتر ہوتی ہے۔ اللہ اللہ کرو، مگر اپنی جگہ پر واپس جاؤ اور اپنے حلقہ میں دین کی دعوت دو۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ سنبھل گئے ہیں۔ ان کا نام محمد الفقیہی ہے۔ کمال ہے کہ جہاز اُڑانے کا سویلین لائسنس رکھتے ہیں اور ہزاروں ڈالر ماہانہ تنخواہ پا سکتے ہیں۔ اب کہہ رہے تھے کہ ان شاء اللہ واپس جاتا ہوں، لائسنس درست کروا کر کسی ہوائی کمپنی میں پائلٹ بن کر وہاں دین کا کام بھی کروں گا۔ انہوں نے ایک بہت عجیب بات بتائی کہ مڈل ایسٹ کی ہوائی فوج میں ہمیں یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ دورانِ پرواز کبھی بیت اللہ کے عین اوپر سے جہاز مت گزارنا۔ ورنہ جیسے ہی جہاز بیت اللہ کے عین اوپر آتا ہے، اس کے سارے گیجٹس (Gadgets) کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور سُوئیاں چکّر میں لگ جاتی ہیں اور پائلٹ پھر کچھ نہیں سمجھ سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے؟ یا سمت کیا ہے؟ رفتار اور بلندی وغیرہ کتنی ہے؟ کہنے لگا اس کا سبب وہ بھی نہیں جانتے مگر ہوتا یوں ہی ہے، تو سمجھ آئی کہ بیت اللہ پر نازل ہونے والے مسلسل انوار کتنے قوی ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ان انوارات کا تذکرہ میں نے تفسیر ''اسرار التنزیل'' میں کیا ہے۔ دوسری بات اس نے سائنس کے حوالے سے کی کہ ایک بہت چھوٹے ذرّے میں، جسے ایٹم کہا جاتا ہے، الیکٹرون اور نیوٹرون چکر لگاتے رہتے ہیں جن کا سسٹم اگر اُلٹ دیا جائے تو ایٹم بم بن جاتا ہے اور بہت بڑا دھماکہ ہوتا ہے، تباہی پھیل جاتی ہے۔ تو میں سوچتا ہوں کہ قرآن کہتا ہے سورج مغرب سے طلوع ہوگا، پھر قیامت آجائے گی گویا سارے یونیورس کا انتظام اُلٹ ہو جائے گا تو کس قدر بڑا دھماکہ ہوگا، آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔

ایٹم بم کی جائے ولادت:

اس علاقے میں ہی امریکہ کا وہ شہر ہے جہاں پہلا ایٹم بم بنا، جو جاپان پہ استعمال کیا گیا تھا۔ یہاں سے ایک سمت پہاڑوں میں ایک شہر لاس الماس (Los Alamos) ہے جس کی روشنی دارالسلام سے نظر آتی ہے، وہاں وہ مرکز ہے۔ اور بہت سے مراکز بھی امریکہ

دارالسلام میں کھڑکی سے باہر کا ایک منظر

دارالسلام میں ایک غیر مسلم وفد سے اسلام پر بات کرتے ہوئے

دارالسلام عمارت کے سامنے کی وادی

نے بنائے، جن میں تین کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اب روس کے خاتمہ سے مطمئن ہوکر وہ سب ختم کر کے سارا کام پھر سے صرف اسی جگہ منتقل کر رہے ہیں۔ وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ لوگ اعتراض کرتے تھے کہ قریب کی آبادی متاثر ہوتی ہے۔ اب کوئی مجبوری بھی نہیں تو وہ سب بند کر دیں گے اور یہاں صرف انڈین رہتے ہیں، اکثریت ان علاقوں میں انہی کی ہے اور ان کی نہ کوئی تنظیم ہے، نہ اثر، لہٰذا انہیں جمہوریت میں انسان شمار نہیں کیا جاتا۔ یعنی جب وہ شور نہیں مچا سکتے تو اگر مرتے بھی رہیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ یہ یہاں کی جمہوری قدریں ہیں جنہیں (The New World Order) بنائے جانے پر زور لگایا جا رہا ہے۔ بہر حال ہم نے بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ڈیرہ لگا دیا، خود ہی پکانا پڑا اور خود ہی کھانے والے ہاتھ۔ فیض اور فاروق معاون باورچی تھے اور میں باورچی خانے کا ہیڈ، چنانچہ خوب موج رہی۔ وہاں کے منتظمین نے دعوت کی، جو کھانے کے لیے ہمیں (AlBeque Inn) جانا پڑا۔ کھانا تو خیر ہوٹل سے کیا کھاتے، ان سے ملاقات رہی۔ مختلف موضوعات پہ بات ہوئی، جس میں وہ ذکر سے بہت خوفزدہ تھے کہ ان کی بربادی کا سبب وہی بنا تھا۔ مگر خیر! ہم نے انہیں مغرب پہ مسجد آنے کی دعوت دی۔ یہ ہوٹل بھی نرالا ہے یعنی یہاں نہ حرام کھانا ملتا ہے اور نہ شراب۔ اور امریکہ میں یہ بہت عجیب بات ہے۔ اور ہے لب سڑک کہ یہ سڑک اگلی ریاست کولوراڈو (Colorado) جا رہی ہے اور عموماً چلتی رہتی ہے، مگر میلوں کوئی ہوٹل نہیں۔ چنانچہ لوگ رکتے ہی رہتے ہیں اور یہ سوال ضرور کرتے ہیں کہ بھئی شراب کیوں نہیں؟ تو جواب ملتا ہے کہ دارالسلام کی ملکیت ہے اور اسلام میں شراب نہ صرف پینا منع ہے بلکہ اس کا کاروبار بھی حرام ہے۔ یہاں اسلام کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو یوں اسلام کا تعارف کرانے یعنی تبلیغ کا موقع ہاتھ آتا ہے۔

مغرب پہ آٹھ دس لوگ جمع ہو گئے۔ نماز کے بعد ذکر پر انگریزی میں بیان ہوا اور توجہ، اس کی ضرورت، ذکرِ قلبی کا طریقہ اور اس کے عملی زندگی میں فوائد پہ بات ہوئی، تو کہنے لگے اس پر کس کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ بھئی! ہم تو اُس وحشت کو ذکر سمجھے بیٹھے ہیں اور وہ واقعی ڈرنے کی چیز ہے۔ دوسرے روز جمعہ تھا اور جمعہ کا خطبہ سننے اور نماز کا طریقہ دیکھنے کے لیے پاس کے ایک امریکی مرکز سے وفد آ گیا جو غالباً بائیس مرد وزن پر مشتمل

تھا۔ بیان سے پہلے بھی ان سے ملاقات رہی، پھر سب نے بیٹھ کر بیان سنا جو مختصر تو تھا کہ وقت ہی اتنا تھا مگر اسلام کا ایک جامع سا تعارف، جس پر اُنہوں نے بعد میں بہت سوالات کیے اور ڈاکٹر فاروق صاحب نے کافی دیر بڑے خوبصورت جواب دیئے۔ یوں یہ دِن بہت خوبصورت تھا۔

ہرن کی موت:

راولپنڈی فون کیا تو علی احمد صاحب نے ہرن کی موت کی خبر دی۔ ہاں! موت کی خبر، ایک بے لوث محبت کرنے والے کی موت۔ میں نے عمر شکار اور جنگلی حیات کے مطالعہ میں بسر کی ہے، جس میں ایک اصول ہے کہ اڑیال پالا جائے تو بے پناہ محبت کرتا ہے، مگر ہرن پالا جائے تو وہ محبت نہیں کرتا، مانوس تک نہیں ہوتا، جب کھول دوگے بھاگ جائے گا۔ میں نے اڑیال بھی پالا تھا اور اس نے مجھ سے محبت کی تھی۔ کس حد تک! اس کا اندازہ لگائیں کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور کبھی کھل جاتا تو محلے میں طوفان بپا ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو قربانی کے لیے پیش کر دوں۔ جیپ میں ڈالا اور لے گیا، بہت خوبصورت تھا، اُنہیں بھی پسند آیا اور ذبح کرنے کی بجائے رکھ لیا۔ اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ فرماتے تھے: سمجھ نہیں آتی تھی کہ وجہ کیا ہے؟ ایک روز ٹیپ پر آپ رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کسی نے میری تقریر لگائی تو وہ سن کر چونکا اور دیر تک آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے چرنا بھی شروع کر دیا اور یوں اسے روز ٹیپ سنایا جانے لگا تو وہ سنبھل گیا۔ پھر ایک روز طے ہوا کہ ٹیپ نہ سنایا جائے کہ یہاں کے لوگوں سے بھی ہل جائے۔ دو روز ٹیپ نہ سنایا گیا تو بے حال ہو کر گر گیا، چنانچہ ذبح کر دیا گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے بتایا کہ عجیب بات ہے جب سینہ کھول کر دل نکالا گیا تو اس میں بال آ گیا ہوا تھا یعنی ایک طرف سے پھٹ گیا تھا۔ اللہ یہ محبت! ایک جانور کو بھی اس قدر شدید محبت ہو سکتی ہے؟ پھر ہرن سے دوستی کی تو یہ اس سے بھی بڑھ کر دیوانہ نکلا۔ خوبصورت آنکھوں سے تکا کرتا تھا۔ اگر میں کھڑکی کھولنا بھول جاتا تو آواز سن کر باہر سے کھڑکی پیٹا کرتا۔ کبھی میں چھت پر سے دیکھنے جاتا تو اُچھل اُچھل کر اوپر آنے کی ناکام کوشش کرتا۔ پچھلے دِنوں بہت موٹا ہو گیا تھا تو کسی نے کہا کہ ہرن تو بانکا ہی خوبصورت لگتا

ہے' یہ موٹا ہوگیا ہے، پھر میں لندن چلا آیا۔ کوئی تین ہفتے بعد پلٹا تو آ دھا رہ گیا تھا۔ دو ہفتے پھر اس سے ملاقات رہی تھی کہ امریکہ چلا آیا اور اب میرے بعد وہ ہجر و وصال کے جھنجھٹ سے آزاد ہوگیا۔ اللہ! کیا خوبصورت دوست تھا۔ زندگی کا ایک بہت تاریک موڑ موت ہے۔ ہر ایک کو یہاں سے گزرنا ہے۔ اور یہ ایک طرح سے اچھا ہوا، وہ بے چارہ اب جدائی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ چلو کوئی تو اِن صبر آزما لمحات کی قیدِ تلخ سے چھوٹا، مگر یہاں دُور دراز بھی اس کی موت کا سن کر آنسو ٹپک پڑے۔ یہ محبت بھی ایک انوکھی مصیبت ہے۔

''کیوں ٹپکے تیرے آنسو، کہاں چوٹ پڑی ہے''

کار کی خریداری:

بہر حال! آج ایک ضرورت تو یہ پیش ہے کہ کچھ کھانے کو لایا جائے جو یہاں سے کم و بیش بیس میل دور ''اپسی نیولا''، نامی چھوٹے سے شہر میں ہی مل سکے گا۔ ساتھ دوسرا فیصلہ یہ ہوا کہ کار خریدی جائے جو اِن کم آباد علاقوں میں یقیناً سستی ملے گی۔ تھوڑی استعمال شدہ لے لیں گے تو اس کے دو فائدے پیشِ نظر ہیں کہ ایک تو جہاز کا کرایہ بچے گا، جبکہ کار نیو یارک پہنچ کر ان شاء اللہ اسی قیمت پر بک جائے گی، ہوسکتا ہے زائد پیسے دے جائے، اور دوسرا سارا امریکہ گھوم پھر کر دیکھنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ گھر سے نکلے، پہلے اپسی نیولا میں گاڑیاں دیکھیں، پھر آگے روانہ ہوئے۔ سینٹا فی پہنچے، ایک گیراج دیکھا، پھر دوسرے میں ایک گاڑی پسند آگئی۔ سودا کرتے کراتے آخر خرید ہی لی، 'شورلیٹ کارسیکا' سفید رنگ کی 90 ماڈل، 16,000 میل چلی ہوئی، فلی لوڈڈ آٹو شفٹ، بہت خوبصورت 7500 ڈالر میں ملی۔ لکھتے پڑھتے دیر ہوگئی۔ عشاء کے وقت وہاں سے نکلے تو غذا کے سٹور بند ہو چکے تھے۔ رات گئے واپس پہنچے تو کچھ گزشتہ بچا کھچا کھانا ہاتھ آیا۔ رات اسی پر بسر ہوئی، صبح اٹھ کر پھر اپسی نیولا گئے کہ راشن تو لے آئیں۔ دوپہر کو آئے تو ڈاکٹر فاروق صاحب نے بتایا کہ مسجد کے ساتھ سابقہ شیخ کی رہائش گاہ آپ کے لیے کھول دی گئی ہے، جو اَب تک کسی کو نہ دی گئی تھی لہٰذا اس کی صفائی وغیرہ کرانی پڑے گی۔ کھانا کھا کر وہ فیض اور فاروق کو لے کر

صفائی کرانے چلے گئے۔عصر کے لیے کرنل صاحب اور میں بھی گئے۔

پُر تکلف رہائش گاہ:

شام تک ہم نئے گھر منتقل ہو گئے جو بہت خوبصورت تھا۔کمرے لکڑیوں کی جالیوں سے مزین اور قدیم قیمتی قالینوں سے سجے تھے۔بہت قیمتی کتب خانہ اور قرآن کریم کے نادر نسخے۔شیخ کے سونے کے کمرے میں (Water Bed) واٹر بیڈ تھا جو میں نے پہلی بار دیکھا اور باقی جتنے روز وہاں رہا، اس پر سوتا رہا۔لکڑی کا خوبصورت ڈبل بیڈ بنا ہوا تھا جس میں پانی کی بھری ہوئی دوفٹ موٹی ٹیوب ہوتی ہے، اُوپر فٹ بھر موٹا گدا، اور بستر پر سونے سے یوں پتا چلتا ہے جیسے آپ سمندر پر تیرتے پھرتے ہوں، جدھر پلٹو تو پانی اچھل اچھل کر لوریاں دیتا ہے۔خوبصورت قمقمے، ٹیلیویژن، کمپیوٹر اور کتابیں، اندر سے ایک چھوٹا دروازہ بیٹھنے اور ذکر کے کمرے کو بھی جاتا جس میں قدیم قالین سجے تھے اور کتابوں سے الماریاں بھری ہوئی تھیں۔ایک طرف غسل خانہ بہت جدید قسم کا اور دوسری طرف کچن۔درمیان میں گیلری لکھنے پڑھنے کے کمرے میں لے جاتی جو مین (Main) دروازے سے بھی ملا ہوا تھا اور اس میں سے ایک دروازہ پیچھے بھی کھلتا تھا۔چنانچہ ہم نے اسے درست کر کے آئندہ ذکر کا اہتمام بھی کیا۔کچن بھی آباد ہوا اور سارے کمرے بھی۔یوں باقی روز وہاں گزارے۔لوگ اگرچہ تھوڑے ہیں مگر بہت مخلص اور محبت کرنے والے۔ایک ساتھی نے بکرا ذبح کیا، جس کی دعوت بہت لوگوں نے مل کر کھائی اور ذکر کیا، کچھ گردنواح کو دیکھا۔عجیب خوبصورت پہاڑی مناظر ہیں۔یہاں کا مشہور شکاری پرندہ سیاہ شاہین اُڑتا ہوا دیکھا جس کا رنگ گہرا سرمئی ہوتا ہے اور نیچے سے آدھا حصہ سفیدی لیے ہوئے ہوتا ہے۔بہت وحشی ہوتا ہے، سدھایا نہیں جا سکتا۔قریب جنگل میں مختلف جانور ہیں، مگر جانے اور دیکھنے کی فرصت کسے ہے۔ہاں !ایک روز مسجد کے ساتھ کی اکیڈمی اور لائبریریوں کی ساری عمارت کھلوا کر دیکھی۔منتظمین سے بات ہوئی کہ مل جل کر اسے پھر سے چلانے اور آباد کرنے کا کام کیا جائے کہ امریکہ بھر میں ایک مرکز بن جائے۔

آخری شام کا کھانا "محمد بنجمن بن وان حاتم" کے ہاں تھا جس کا خوبصورت چھوٹا سا

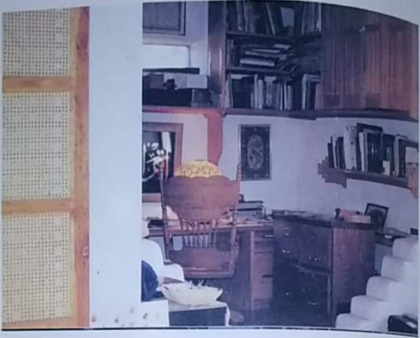

دارالسلام میں پڑھنے کا کمرہ

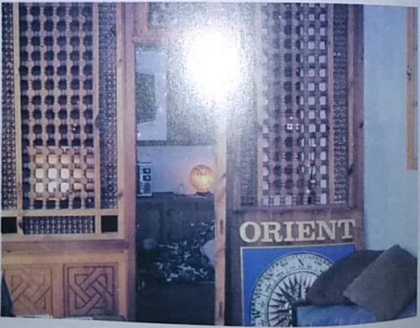

دارالسلام میں شیخ کا پرتکلف کمرہ

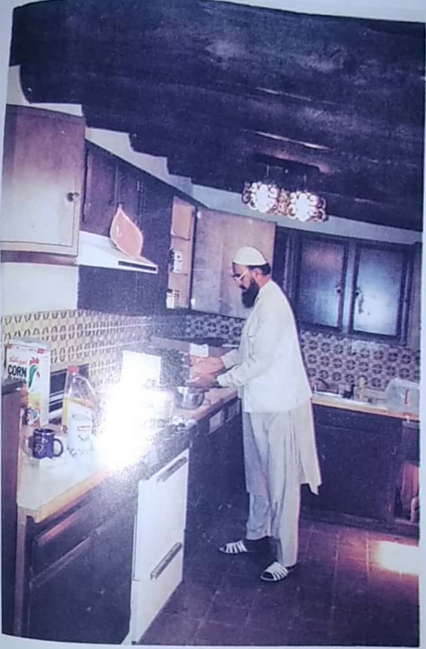

دارالسلام کے کچن میں کھانا پکاتے ہوئے

گھر دریا کنارے ہے۔ کھانے پر گئے تو دریا کو بھی قریب سے دیکھا۔ اس جگہ کا موسم تو ویسے ہی خوبصورت ہے مگر ایک عجیب ادا بھی رکھتا ہے کہ یہاں کبھی کبھی اوپر سے ہوا گرتی ہے۔ جی ہاں! ہوا گرتی ہے جیسے بارش برستی ہے، یعنی اوپر سے سیدھی نیچے آتی ہے کہ گردا گرد پہاڑوں کی بلند چوٹیاں ابھی تک برف کو سینے پہ سجائے ہوئے ہیں، اور اس سے سروں کو ڈھانپ کر نظارہ عالم میں محو ہیں، تو ذرا بادل آیا، اوپر کا درجہ حرارت ٹھنڈا ہوا اور ہوا کے گرنے کا عمل شروع، جسے (Wind Fall) ہی کہتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ درجہ حرارت فوراً گر جاتا ہے یعنی ابھی 60^{O} پر تھا کہ ہوا گرنا شروع ہوئی اور تین منٹ میں تینتیس پر جا پہنچا۔ صبح تک دس گیارہ ڈگری تھا اور آپ کو بہت موٹے کوٹ پہننے کی ضرورت پیش آ گئی۔ بہر حال کب تک، آخر صبح ذکر کے بعد ہم اسی نئی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہو گئے، ساتھ فاروق کی کار بھی تھی اور سب کا ارادہ سان ڈیاگو (San Diego) جانے کا بنا جو یہاں سے 950 میل سفر بنتا ہے کہ پہلے 150 میل چل کر واپس البقرقی (Albuqerque) پہنچے، یہ وہ راستہ تھا جو ہم نے پہلے روز اختیار کیا تھا۔ وہاں سے سان ڈیاگو کی سڑک پر مڑ گئے۔ میں اور فاروق نئی کار میں تھے اور پیچھے کرنل صاحب اور فیض احمد، فاروق کی کار میں۔ یہ جنوب مغربی ریاستیں تقریباً ویران پڑی ہیں اور بڑی سڑک پر بھی چالیس چالیس میل، کوئی پٹرول پمپ تک نہیں ملتا، اور جہاں ملتا ہے وہاں بھی ویرانے ہی ہیں۔ کبھی کبھار چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزر ہوتا ہے جہاں ضروریات زندگی کے علاوہ جو چیز بہت ہے وہ ریڈ انڈینز کی اشیاء ہیں، جن میں ان کے قدیم ہتھیار، خاص قسم کی بنائی ہوئی چٹائیاں اور ان کے مخصوص زیورات جو عموماً سفید چاندی جیسی دھات میں جگہ جگہ فیروزے سے جڑے ہوتے ہیں اور بس۔ تقریباً ہر شہر میں اور ہر پٹرول پمپ پر ان نوادرات کی دوکان ہے۔ ہاں! ساتھ مٹی کے بنے ہوئے جانور، کھلونے اور ان کے اس زمانے کے فوٹو بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ انہی جیسی جھونپڑیاں بنا کر، جو عموماً لمبی لمبی متعدد لکڑیوں کو اوپر سے ان کے سرے تقریباً 2 فٹ چھوڑ کر باندھ دیئے جاتے اور نیچے سے پھیلا کر زمین پر کھڑا کر دیا جاتا، پھر گرداگرد ایک خاص کپڑا جو اسی غرض سے تیار کیا جاتا

تھا، لپیٹ کر گھر بن جاتا۔ جس میں گھٹنوں کے بل داخل ہونے کا راستہ ہوتا اور اس کے گرد ایک خاص جھاڑی کی ٹہنیاں ساتھ ساتھ رکھ دی جاتیں، غالباً اس سے حشرات الارض گزر کر اندر نہیں آتے۔ باہر صحن کو کھوپڑیوں سے سجایا جاتا۔ زمین پر ان جانوروں کی کھوپڑیوں کو جو اس کنبے نے شکار کیے، یا کاٹ کر کھائے اور لکڑیوں پر ان انسانوں کی کھوپڑیوں کو جو صاحب خانہ کا شکار بنے، سجایا جاتا اور انہیں کی طرح سجا کر (سوائے انسانی کھوپڑیوں کے) وہاں نوادرات فروخت کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور یہ یہاں وہاں بہت سی جگہوں پر ملتا ہے۔ نیو میکسیکو کا آخری شہر گیلپ (Gallup) ہے جو واقعی چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں کسی شہزادی کی طرح سجا سجایا لگتا ہے۔ ہم یہاں رُکے، کیمرے کی فلم خریدی جس کے لیے بازار کا فی پھرنا پڑا اور پھر کافی پی۔ کچھ بسکٹ راستے کے لیے خریدے۔

ریل گاڑی امریکہ میں:

چلتے رہے، راستہ میں کئی ریل گاڑیاں دیکھیں، سواری کی ریل گاڑی تو ایک ہی ملی جس میں دو انجن تھے اور زیادہ لمبی نہ تھی۔ دو انجن یہاں احتیاط کے طور پر لگائے جاتے ہیں کہ اگر ایک میں کوئی خرابی آجائے تو گاڑی رک نہ جائے۔ تمام ڈبے ہمیشہ ایئر کنڈیشنڈ اور بہترین سیٹوں سے مزین ہوتے ہیں۔ مگر عجیب چیز یہاں کی مال گاڑیاں ہیں، جن میں عموماً پانچ انجن لگے ہوتے ہیں اور کم وبیش دس گاڑیاں یکجا کر دی گئی ہیں، جن میں ریلوے کی بوگیاں بہت ہی کم اور ریلوے کے ٹریلر لگے ہوتے ہیں جو عموماً سو سے پانچ دس زیادہ ہی ہوتے ہیں اور ان پر بڑے بڑے کانٹینر جن کے نیچے پہیے ہوتے ہیں، لادے ہوتے ہیں۔ کمپنی کے ٹرک، لدا ہوا کانٹینر اوپر کھڑا کر جاتے ہیں جو بہت لمبا اور بہت بڑا ہوتا ہے۔ جہاں اُترے گا اسے گاڑیاں اپنے پیچھے باندھ کر لے جائیں گی اور جو کانٹینر بغیر پہیوں کے ہوتے ہیں، ٹرک کے ٹریلر پر لادے جاتے ہیں۔ وہ اوپر نیچے دو، دو رکھے ہوتے ہیں۔ یوں کم وبیش ڈیڑھ سو سے زائد تو بڑے بڑے کانٹینر ہی لدے ہوتے ہیں۔ کچھ تیل کے ڈبے اور بوگیاں الگ، اور یوں ریلوے کی سنگل لائن بھی بار بار مصروف نہیں ہوتی،

تھوڑے انجن بہت سامان لے جاتے ہیں اور مال جلد پہنچتا ہے۔ گیلپ سے آگے چیک پوسٹ ہے، جہاں پھر وہی سماں بنایا گیا ہے۔ کچھ جانور بھی باڑوں میں رکھے ہیں جو اس علاقے کے جنگلات کے ہیں، اور ریڈ انڈین کی مشہور اشیاء کی فروخت کا اہتمام بھی ہے۔

امریکہ کی فوجی تنصیبات:

آگے ایری زونا کی ریاست شروع ہو جاتی ہے جس کے بالائی علاقے میں پہاڑ نسبتاً بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض تیرہ ہزار فٹ تک جا پہنچتے ہیں، جن کی چوٹیوں پر تا حال برف چمکتی نظر آتی ہے۔ ایری زونا اور گیلپ کی حد پر ایک آرمی ڈپو ہے، جس کا صدر دفتر باہر سے نظر آتا ہے اور آگے میلوں میں سیمنٹ کے بنکروں کی ابھری ہوئی خیموں کی طرح کی چھتیں دکھائی دیتی ہیں، باقی سارا کام زیر زمین ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑا شہر زیرِ زمین آباد کیا گیا ہے۔ امریکہ کی اکثر فوجی تنصیبات، سٹور، گودام اور تباہ کن ہتھیاروں کی فیکٹریاں انہی جنوب مغربی ویرانوں میں ہیں۔ ان سب علاقوں میں جہاں بڑی سڑک پر دور دور تک ویرانی کا راج ہے، اگر سڑک سے اتر کر دائیں بائیں جائیں تو سوائے ویرانے کی مزید گہرائی کے اور کچھ نہ ملے گا۔ یوں ہم ان خوبصورت پہاڑی راستوں سے گزرتے فلیگ سٹاف تک پہنچے جو ''ایری زونا'' یعنی اگلی ریاست کا ایک (یا اس علاقے میں) واقعی بڑا شہر ہے۔ اس سے پہلے جنگل شروع ہو جاتا ہے جو دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں درختوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ سیر گاہیں بنی ہیں۔ لوگ آ کر کیمپنگ کرتے اور سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ شہر کے ایک طرف پہاڑی کی بلندی پر فوجی تنصیبات ہیں اور گرداگرد خوبصورت جنگل، بلکہ شہر اور جنگل ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔ ہر سڑک پر خوبصورت درخت ہیں۔ یہ شہر سات ہزار 7000 فٹ کی بلندی پر ہے جہاں بہت خوبصورت موسم ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں آوارہ بادل اٹھکیلیاں کرتے پھرتے ہیں۔ چلتے چلتے ایک ٹکڑا برسنے لگتا ہے تو جونہی وہ آگے نکلتا ہے پیچھے سنہری دھوپ آ جاتی ہے۔ جنگل کے پچاس ساٹھ میلوں میں ایسا کئی بار ہوا۔ اس شہر سے ہم نے سان ڈیاگو کی طرف راستہ پکڑا تو اُترائی شروع ہو گئی اور کچھ ہی میلوں بعد ہم چار ہزار فٹ پر تھے۔ سڑک چوڑی

اور خوبصورتی سے بل کھاتی اتر رہی تھی۔ وسط جنگل میں ایک جگہ رکے، جیسا کہ امریکہ میں ہر بڑی سڑک پر ریسٹ ایریا بنا ہوتا ہے جہاں پانی، غسل خانہ اور بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ ہم نے وضو کیا، نماز ادا کی اور کھانا کھایا جو ساتھ رکھا تھا۔ دور دور تک خوبصورت پہاڑ نظر آ رہے تھے جن میں چھوٹے جہاز سیاحوں کو اُڑائے پھرتے تھے۔ مشہور کینین (Canyon) بھی وہاں سے ذرا دور دکھائی دیئے، جنہیں دیکھنے اور ان میں قدیم غاروں کو دیکھنے لوگ دور دراز امریکہ سے آتے رہتے ہیں۔ وہاں سے چلے تو مسلسل اترتے چلے گئے اور نیچے پھر عجیب قسم کا صحرائی تھوہر دیکھنے کو ملا۔ دس دس بارہ بارہ اور بعض اوقات اس سے بھی اونچا ستون کا ستون، جس میں دو چار یا چھ بازو (ہندوؤں کے دیوتا کی طرح) نکلے ہوئے نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ ایری زونا سٹیٹ کا نشان بھی یہی ہے۔ پہاڑ عموماً سفید مٹی اور چٹانوں سے بنے ہیں، پھر ایک دم سیاہ پہاڑ اور جیسے لاوا جما ہوا نظر آتا ہے۔ یہ گیلپ سے آگے بھی ہر طرف پھیلا ہوا تھا، اور پہاڑی کے آخر میں بلیک کینین سٹی (Black Canyon City) آتا ہے جو پہاڑی علاقے کا آخری شہر ہے، اور اونچے نیچے ٹیلوں پر بڑی خوبصورتی سے بچھایا گیا ہے۔ اور پھر ہم پہاڑ سے نکل چکے تھے۔ آگے سرخ مٹی کا صحرا جس میں بگولے سے اٹھ رہے تھے، مگر وہ تیز نہ تھے کیونکہ موسم بیت چکا تھا۔ یہاں بڑا شہر فینکس (Phoenix) ہے جو خوبصورت پھولوں اور صحرائی درختوں سے سجا تھا۔ یعنی کھجور نما درخت اور باریک پتوں والے صحرائی درخت کافی تھے، مگر پھولوں کی باڑیں بھی بہت نظر آئیں۔ یہاں بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہیں اور خوبصورت شہر ہے۔ موسم گرم ہے کہ یہ علاقہ تقریباً سمندر ہی کی سطح (Sea Level) کے برابر آ جاتا ہے۔

یہاں سے ہم نے سان ڈیاگو کی سڑک لی۔ تقریباً نصف میں پہنچے تو رُک کر ظہر ادا کی اور چلے ہی تھے کہ فاروق کی کار کچھ گڑبڑ کرنے لگی۔ دو میں سے ایک فین بیلٹ ٹوٹ گیا، کچھ دیر اسے بدلنے میں لگی، تھوڑی دور چلے تو واٹر باڈی کا بیرنگ ٹوٹ گیا چنانچہ مجبوراً کھڑا کرنا پڑی اور سارا سامان ایک کار میں منتقل کر کے نزدیک ترین پٹرول پمپ پہنچے۔ حسنِ اتفاق کہ وہاں چھوٹی سی آبادی بھی تھی اور ایک ورکشاپ بھی۔ وہاں سے انہوں نے وہ گاڑی منگوائی جو کھینچ کر لاتی ہے، پھر اس کے ساتھ جا کر کار کو لائے اور ورکشاپ کے سپرد کر

دیا۔ اس طرح وہاں عصر اور مغرب کی نماز ادا کی اور کوئی چار گھنٹے صرف کرنے کے بعد آگے چلے۔ یوں اپنے اندازے یعنی نو بجے رات سے چار گھنٹے تاخیر سے (ایک بجے) سان ڈیاگو پہنچے اور سو گئے۔ یہ بھی امریکہ کا غالباً چھٹا بڑا شہر ہے۔ یعنی نیو یارک، شکاگو، لاس اینجلس، ڈیٹرائٹ، ہیوسٹن اور سان ڈیاگو۔ یہ شہر چھوٹے بڑے پہاڑوں میں پھیلا ہوا ہے اور ایک طرف وسیع سمندر ہے۔ جنوب مغربی کونے پر آخری شہر ہے اور پاکستان سے پورے بارہ گھنٹے کا فرق ہے، یعنی پاکستان سے دور ترین مقام ہے۔ اب آگے سمندر اور پھر جاپان آئے گا۔ یہاں امریکہ کی بہت بڑی نیول اکیڈمی اور نیوی کے بے شمار مختلف قسم کے جہازوں کا کام ہوتا ہے اور ہر قسم کا جہاز کھڑا ہوتا ہے۔ بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ جنرل ڈائنا مکس مشہور کمپنی جس نے پٹریاٹ میزائل بنایا، یہاں سمندر کے کنارے پر وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اور بھی بہت سے مہلک ہتھیار بناتی ہے۔ ساتھ کے پہاڑوں میں اس کا تحقیقاتی مرکز ہے۔ اسی طرح کے ہتھیار بنانے والی ایک اور کمپنی سولر ٹربائن بھی اسی شہر میں ہے۔ جنوب میں اس کی سرحد میکسیکو سے ملتی ہے جو ایک غریب اور انتظامی اعتبار سے ناکارہ ملک ہے۔ بھوک، افلاس، رشوت اور بے انصافی بالکل اپنی طرح سے ہے۔ اس کا فائدہ امریکن اس طرح لیتے ہیں کہ وہ لوگ بغیر ویزے کے ادھر آجاتے ہیں اور چوری چھپے سستے داموں مزدوری کرتے ہیں۔ یوں یہاں والوں کی چاندی ہے۔

ڈرائیونگ لائسنس اور امریکی تجزیہ:

ہم علی الصبح موٹر وہیکل ڈیپارٹمنٹ گئے کہ ڈرائیونگ لائسنس حاصل کریں۔ پہلے امتحان دینا پڑتا ہے، ہم نے پرچہ لیا اور بیٹھ گئے اور فیل ہوئے کہ کچھ پتا نہ تھا۔ پھر یہاں کی عجیب شئے (Sea World) دیکھنے چلے گئے، جہاں بے پناہ ہجوم ہوتا ہے اور سمندری جانوروں کے مختلف کرتب مختلف جگہوں پر مختلف اوقات میں دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ ایک عجیب تماشا تو ہم نے بھی دیکھا، وہ تھی ''سی ونڈو''۔ بہت سے لوگ ایک اندھیرے ہال میں سیٹوں پر بیٹھ گئے اور سامنے فلم چلنے لگی، جیسے ہم کسی آبدوز میں بیٹھے ہوں اور مختلف قسم کی

سمندری مخلوق سامنے سے گزر رہی ہو۔ کیپٹن کی آواز آئی کہ یہ کرو، وہ کرو اور آپریٹرز کی آواز سنائی دیتی کہ ادھر رخ موڑ دیا، یا وہ کچھ آن کر دیا اور سین بدلنے لگتے، یہ کوئی پندرہ منٹ کا کھیل تھا اور میرے خیال میں تو بچوں کی دلچسپی کا تھا۔ ہمیں تو وہاں جمع ہونے والی مخلوق سب سے بڑا تماشہ لگی، اور ہم ان کے لیے تماشہ تھے کہ اس دور میں یہ کیسے لوگ ہیں۔ وہ ہمیں عجیب لگتے کہ لباس نام کے دو چیتھڑے ہر مرد و زن اور بچہ بوڑھا لیے پھر رہا ہے۔ عجیب وغریب حلیے اور نرالے لباس، بہر حال وہاں سے پھر پلٹے اور DMV یعنی لائسنسوں والے دفتر پہنچے کہ پہلی بار 10 ڈالر فیس دی تھی، اس میں آدمی تین بار امتحان میں شرکت کر سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر قطار میں کھڑا ہونا پڑا کہ پرچہ لینے کے لیے ضروری تھا۔ میرے سامنے جو کچھ بھی تھا، وہ عجیب مخلوق تھی۔ بال عورتوں جیسے لمبے، ایک کان میں لمبی سی بالی اور نوجوان لڑکی کی طرح چھاتیاں کہ اس نے صرف بنیان نما سی شے قمیص کی جگہ پہن رکھی تھی، اور میں اسے نوجوان لڑکی سمجھ کر سست کر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور "ہیلو" کہا تو حیرت ہوئی کہ ڈاڑھی منڈھی ہوئی اور مونچھوں کا بھی ایک خاص کٹ بنا ہوا، اب پریشانی یہ تھی کہ یہ لڑکا ہے، یا لڑکی۔ کرنل صاحب کو متوجہ کیا، فیض کو اُردو میں بتایا مگر سب سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہم نے فاروق کو بلایا کہ وہ تو یہیں رہتا ہے، ضرور سمجھتا ہوگا، تو اس نے کہا اگر تو ڈاڑھی کسی علاج سے اگائی ہے تو لڑکی ہے، یا پھر چھاتیاں کوئی ٹیکہ لگا کر اگائی ہیں تو لڑکا ہے۔ یہاں اب ایک نسل ایسی ہے جس میں لڑکیاں مختلف دواؤں سے بال بڑھاتی اور اگاتی ہیں تو ان کی داڑھی آ جاتی ہے۔ اور بعض لڑکے ٹیکہ لگواتے ہیں تو عورتوں کی طرح چھاتیاں بن جاتی ہیں۔ مجھے وہ کہاوت یاد آئی کہ کسی سردار جی سے بچوں نے پوچھا تھا کہ یہ کبوتر ہے یا کبوتری؟ تو فرمانے لگے: دانہ ڈال کر دیکھ لو اگر چگتا ہے تو کبوتر اور اگر چگتی ہے تو کبوتری ہو گی۔ یہاں بھی ہم سے فیصلہ نہ ہو سکا، حتیٰ کہ اس سے باتیں بھی ہوئیں مگر یہ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی کہ حضور آپ شے کیا ہیں؟ کہ پرچے کی باری آ گئی، پرچہ دیا اور ہم دونوں پاس ہو

ناسامیں

ناسا کا دورہ کرتے ہوئے

ناسا میں خلاباز

گئے۔ چنانچہ ایک سال کے لیے عارضی لائسنس مل گیا۔ اب پکا لائسنس حاصل کرنے کے لیے روڈ ٹیسٹ دینا ضروری تھا۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی، ساتھ دیر بھی ہوگئی تھی۔ گھر چلے گئے جہاں سے پچھلے پہر شہر کی سیر کو گئے۔ سمندر پر بنے ہوئے ایک عجیب پل کو دیکھا جو ہرن کے سینگ جیسے پتلے اور بانکے ستونوں پہ کھڑا ہے اور اوپر سے گاڑیوں کا ہجوم گزر رہا ہے، جبکہ نیچے سے بڑے بڑے بحری جہاز گزر رہے ہیں۔ پل کے اوپر سے میکسیکو کا علاقہ اور بعض قریبی شہر نظر آ رہے تھے۔ شہر کے کچھ دوسرے حصے دیکھے۔ ہوائی اڈہ بھی ایک جزیرہ نما ہے جو شہر کو ملا رہا ہے، جس کے نیچے کا زیادہ حصہ سمندر کا ہے اور واپس آ گئے۔ دوسرے دِن روڈ ٹیسٹ دینے گئے مگر کرنا اللہ کا یہ ہوا کہ ہم دونوں کو انسپکٹر نے فیل کر دیا۔ پھر ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا کہ میں نے ہزار میل کا سفر تو کر لیا تھا مگر اب شوگر لیول بھی بڑھ گیا اور بلڈ پریشر بھی۔ تو طے ہوا کہ میں ہوائی جہاز سے ہیوسٹن پہنچوں جبکہ کرنل صاحب اور فیض کار لے کر چلیں۔ چنانچہ پچھلے پہر پانچ بجے کے قریب 13/6 کو یہ دونوں حضرات چل پڑے اور میں رات ٹھہر گیا کہ صبح 11 بجے پرواز تھی۔ صبح ایک اور ٹیسٹ کے لیے چلا گیا مگر اس خاتون نے یہ کہہ کر پاس کرنے سے معذرت کر لی کہ آپ کو ابھی پریکٹس کی ضرورت ہے۔ بات تو اس کی بھی درست تھی۔ اب وہاں سے جہاز پر اور جہاز سے ہیوسٹن کے لیے روانہ ہونا تھا تو سان ڈیاگو کا ہمارا حاصل دو فاروق کے ساتھی اور ایک کابلی افغان جو اس کا دوست تھا، ٹھہرے۔ جنہیں دو روز ذکر کرواتے رہے اور وہ کسی حد تک ذکر سے مانوس بھی ہوگئے اور مسلسل ذکر کے لیے نہ صرف آمادگی ظاہر کی بلکہ باقاعدہ بیعت بھی ہو گئے۔ چنانچہ میں کل وہاں سے اُڑا اور یہاں کے وقت کے مطابق ساڑھے چار بجے ہیوسٹن کے ایک ہوائی اڈے پہ پہنچ گیا جہاں سے مجھے ناصر صاحب لے کر گھر آ گئے۔ رات ساڑھے بارہ بجے فیض اور کرنل صاحب تقریباً ڈیڑھ ہزار میل سفر کر کے پہنچے۔ رات ایک بجے سب نے مل کر کھانا کھایا اور آرام کیا۔ ہیوسٹن میں نے پہلے بھی دیکھا ہے اور شاید غبارِ راہ

(اوّل) میں اس کا تذکرہ بھی ہے۔اب دوبارہ یہاں صرف احباب سے ملاقات ہی ہوگی۔ حسب سابق یہاں کے موسم نرالے ہیں۔آدھ شہر پر سے جہاز گزرا تو دھوپ تھی، پھرآگے اچانک قوس وقزح نظر آنے لگی۔جب جہاز اس میں سے گزرا تو نیچے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔آج صبح ناسا (NASA) دیکھنے گئے جہاں اپالو وغیرہ مشہور راکٹ رکھے ہیں اور اندر بہت بڑا میوزیم ہے۔وہاں سے پلٹے تو ہیوسٹن یونیورسٹی دیکھی، جہاں فیض صاحب کو پلٹ کر آنا ہے اور گھر آ گئے۔اب کل بندہ کو کلیولینڈ جانا ہے جبکہ کرنل صاحب اور فیض واشنگٹن ڈی سی جائیں گے جو مزید ساڑھے چودہ سومیل کا سفر ہے، اور میں رات ٹھہر کر صبح کلیولینڈ سے جو امریکہ کے مشرقی کونے پر ہے، پھر واشنگٹن ڈی سی آؤں گا جہاں سے مل کر ہم نیویارک جائیں گے۔اب آگے جو پیش آئے گا وہ پھر عرض کر دیا جائے گا۔فی الحال اللہ حافظ۔

فقیر محمد اکرم عفی عنہ۔

واشنگٹن ڈی سی

17-06-1991:

ہیوسٹن میں بھی ایک چھوٹا سا گھریلو قسم کا اجتماع تو ہو ہی گیا کہ کچھ صاحب خانہ کے اعزہ جمع ہو گئے اور کچھ اضافہ فورٹ ورتھ سے ایک جوڑے نے آ کر کر دیا جو پہلے سے ذکر کرتے ہیں۔غالباً کئی سال پہلے ان کے ہاں حاضری ہوئی تھی۔بہرحال بیان بھی ہوا جس کا موضوع تھا کہ "اسلام کو ہمیں اپنا ذاتی مذہب سمجھنا ہوگا" تب بات بنے گی۔اب ہم نے مذہب کو ایک خاص طبقے کے سپرد کر رکھا ہے۔علمی طور پر یعنی جاننے کے لیے ہم سمجھتے ہیں یہ مولوی کا کام ہے۔ہمیں جب ضرورت ہوگی اس سے پوچھ لیں

گے۔ جو اکثر اُمور میں تو ہم پوچھا نہیں کرتے اور اگر کبھی پوچھنے کی نوبت آئے تو عموماً اپنی پسند کا جواب چاہتے ہیں، اگر ایک جگہ سے نہ ملے تو دوسری جگہ چلے جاتے ہیں، یا پھر مطلوبہ جواب خریدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور عمل کے لیے ہمارا خیال ہوتا ہے کہ بزرگ کافی ہیں، یہ نماز روزہ کر لیتے ہیں۔ اور اکثر تو بزرگ بھی ابھی خود کو اس بزرگی سے بچا کر یہ کام اپنے پیر کے سپرد کرتے ہیں، اور خود سالانہ فیس ادا کر کے جنت کی قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں، جس کا نتیجہ سامنے ہے کہ ہم نام کو مسلمان، حلیے میں مغربی، رنگت میں مشرقی اور تہذیب میں سب سے بیگانہ ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی شناخت تک گم کر چکے ہیں۔ تو اس کا علاج یہی ہے کہ ہم خود اپنے دین کا مطالعہ کریں اور خود پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں کہ بحیثیت مسلمان ہمارے فرائض کیا ہیں؟ اور ہمیں کیا حقوق حاصل ہیں؟ جہاں تک تحقیقی کام ہے، وہ تو یقیناً ایسا آدمی ہی کر سکے گا جو اس کام پہ عمر صرف کرے گا۔ مگر فرائض کا جاننا سب کے لیے فرض ہے اور واجبات کا علم واجب۔ جہاں تک ممکن ہو بچوں کو علوم حاضرہ کے ساتھ دینی معلومات فراہم کرنے کا بھی اہتمام کیا جائے۔ اور خود بھی ممکن حد تک دینی کتب دیکھنے کے لیے وقت نکالا جائے تا کہ رب کریم ہمارے علم کو عمل کی بنیاد بننے کی سعادت سے بہرہ ور کریں۔ اس کے بعد سب نے مل کر ذکر کیا اور 12 بجے شب یہ محفل برخاست ہوئی۔ علی الصبح اُٹھ کر روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سامان گاڑی میں لادا۔ ساتھیوں نے سڑک کی راہ لی، جبکہ میں ہوائی اڈے پہنچا۔ قریبی اڈہ بھی پندرہ بیس میل تو ہوگا اور دوسرا تو بہت دور ہے۔ جہاز کی روانگی کا وقت ہو چلا تھا۔ کاؤنٹر پر پہنچا تو خاتون نے بتایا کہ 12- نمبر گیٹ ہے اور بہت جلدی جائیں، صرف چند لمحے باقی ہیں۔ چیک اِن سے گزر کر اندر پہنچا تو جلدی ہی جہاز ہمیں لے اُڑا۔ اس پرواز کو ''ڈیلاس'' اُترنا تھا، جہاں سے دوسرا جہاز آگے کلیولینڈ جانے والا تھا۔ کوئی پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ بیگ اُٹھا کر باہر آیا تو ایک خاتون سے پوچھا: مجھے کلیولینڈ جانا ہے، جہاز

کہاں ملے گا؟ اس نے بتایا کہ انتالیس (39) نمبر گیٹ سے آپ باہر جائیں تو شٹل بس ملے گی، اس میں سوار ہو جائیں اور تیرہ (13) نمبر گیٹ پر اتریں، وہاں سے اگلی پرواز ملے گی کہ یہ معاملہ میلوں میں پھیلا ہوتا ہے۔ باہر آیا تو اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ ایک سمت سے بس آ گئی اور ہم سوار ہو گئے، جبکہ کچھ لوگ وہاں پہ اترے، اور ہم چکر لگاتے کوئی دو میل پیدل چل کر اپنی منزل پر پہنچے۔ تھوڑے فاصلے پر بس رکتی، اعلان ہوتا فلاں سے فلاں نمبر تک یہ گیٹ ہے اور فلاں سے فلاں تک اگلا گیٹ ہوگا۔ جب آٹھ (8) سے پندرہ (15) تک کا اعلان ہوا تو ہم بھی چلے۔ اندر پہنچ کر تیرہ (13) نمبر تلاش کیا اور انتظار کرنے والوں میں جا بیٹھے۔ ہوٹل، کھانا، پینا، گفٹ اور تحائف کی دوکانیں اور لوگوں کی کثرت، ہر ایک عجیب و غریب حلیے میں۔ بس ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے کے ساتھ اضافہ کر لیجیے کہ ٹکر ٹکر دیکھا کیے کہ الٰہی کون پاگل ہے؟ یہ تہذیب یا ہم؟ یہ لڑکیاں، یہ عورتیں، یہ کچھا بنیان پہنے ہوئے بزرگ خواتین، یہ گُت اور مینڈھیوں والے جوان، یہ چوڑیاں چھنکاتے، کانٹے چمکاتے گبھرو، اور ان کے بزرگ پاگل ہیں یا اپنا دماغ خراب ہے؟ بس نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ وقت ہوا اور جہاز میں داخل ہو گئے۔ بیٹھنے کو پوری سیٹ خالی مل گئی۔ اور اس سفر میں پہلی بار بہت خوشگوار تجربہ ہوا کہ یہاں اگر کھانے کا وقت جہاز میں آتا ہو تو بتا دیا جاتا ہے کہ میں گوشت نہ لوں گا، سبزی خور ہوں۔ یہ ٹکٹ خریدتے وقت طے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب کمپیوٹر متعلقہ دفتر کو آپ کی سیٹ ریزرو ہونے کی اطلاع کرتا ہے تو ساتھ کھانے کی خبر بھی دے دیتا ہے اور یوں آپ کا مطلوبہ کھانا مل جاتا ہے، جس پر آپ کے نام کی چٹ لگی ہوتی ہے۔ ڈیٹرائیٹ سے آتے ہوئے ہمیں جو کھانا ملا، اس میں صرف سلاد کے پتے اور گاجر کے قتلوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹماٹر تھا، چنانچہ صرف پتے کھائے تھے۔ یہاں بلیک کافی منگوا کر اس کی تلخی حلق میں گھولنے لگا کہ ہوائی میزبان پھر آئی کہ آپ نے سبزی کا آرڈر دیا ہوگا اور شاید آپ مسٹر اعوان ہیں کہ میرے پاس ایک کھانا

سبزی خوروں کا ہے، کیا آپ لیں گے؟ میں نے بے دلی سے ہاں کہہ دی۔ خیال تھا کہ چارہ ہی تو ہوگا اور جہاز کو 12 بجے دوپہر تو اترجانا ہے، جا کر کھالیں گے۔ مگر ناں بھی نہ کر سکا، آخر وضع داری بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ وہ لے آئی تو پہلی بار مزیدار کھانا ملا۔ ایک تازہ اناس خوبصورتی سے کٹا ہوا، اوپر چیری کے تازہ ٹکڑے، ساتھ میں اخروٹ کی گریاں اور سادہ براؤن بریڈ اور خالص شہد۔ بھئی واہ! لطف آ گیا۔ اللہ تجھے مسلمان کردے، بڑا کام کیا ہے۔ مشکل سے اناس ہی کھا سکا اور باقی سامان واپس اٹھوا دیا کہ بہت سارا تھا، وہ مجھے کافی سہارا دے گیا۔ 12 بجے کلیولینڈ پہنچا تو دوست منتظر تھے۔ لے کر گھر آئے تو بتایا کہ ایک بجے آپ کا بیان ہے اور ہم نے ہال بک کیا ہوا ہے۔ وضو کیا، چائے کا پیالہ پیا اور ادھر چل دیئے۔

انسانیت کا دُکھ درد:

احباب نے ہال بک کروا رکھا تھا، بفضل اللہ ہم بروقت پہنچ گئے۔ لوگ آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بیان شروع ہوا۔ تعوذ و تسمیہ اور خطبہ مسنونہ کے بعد جو آیہ کریمہ تلاوت کی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ ہی بہترین جماعت تھے جسے انسانیت کی بہتری اور بھلائی کا فریضہ سونپا گیا، اور جو بھلائی کا حکم کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے، محض اس لیے کہ اللہ پر ایمان یعنی یقین کامل رکھتی ہے۔ اس آیہ کریمہ میں مسلمانوں کی عظمت کا ارشاد ہوا ہے اور بہت بڑی شان ذکر کی گئی ہے کہ عالم رنگ و بو میں آنے والی تمام نسلوں اور تمام امتوں میں تم سب سے بہتر اور بلند درجہ امت ہو اور اس کی وجہ ارشاد ہوئی کہ سارا عالم اپنے لیے جیتا ہے، اپنی ذمہ داری لیتا ہے، اپنا بھلا چاہتا ہے، اپنے آرام کے لیے کوشاں رہتا ہے، اپنی اولاد کی، اپنے قبیلے کی فکر کرتا ہے، یا اپنی قوم اور اپنے ملک کے لیے جیتا ہے اور یہ عالم انسانیت میں کسی کا بلند تر مقام ہے کہ وہ قوم اور ملک کی فکر کرنے والا ہو۔ مگر تم اے مسلمانو! اس سے بھی بہت بلند مقام پر ہو کہ تم دوسری اقوام اور پورے عالم میں نسلِ انسانی

کی بھلائی، بہتری اور ہر طرح کی فلاح کے لیے فکر کرنے اور اس کا اہتمام کرنے کا فریضہ سونپے گئے ہو۔تم وہ ہو جن کا جینا مرنا انسانیت کے لیے یعنی دوسروں کے لیے ہے کہ تم اِک جہاں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو، جس میں خود ان سب کی بھلائی ہے اور ایک عالم کو برائی سے روکتے ہو، جس میں ان سب کے لیے نقصان اور خرابی ہے۔ اور یہ تم ضرور کرتے ہو، ہر حال کرتے ہو، مشکل ہو یا آسان، اس کے نتیجے میں دکھ آئے یا آرام، ہر ممکن حد تک تم یہ کام کرتے چلے جاتے ہو۔ بغیر کسی سے کوئی اجرت مانگے، بغیر شہرت کے لالچ کے، اور بغیر سیاسی عزائم کے کہ تم اللہ کی ذات پر، اس کی صفات پر، اس کی عظمت وقدرت پر، اس کے کرم واحسان پر اور اس کی رحمت وشفقت پر یقین کامل رکھنے والے لوگ ہو، اور محض اس کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے تم یہ عظیم کام کرتے ہو، اور کرتے ہی چلے جاتے ہو۔ اب یہ تعریف تو کتاب اللہ میں مسلمان کی موجود ہے اور مسلمان کو دیکھیں تو یہ خود رُسوا ہے اور ایک دُنیا اسے کچلنے کے درپے ہے۔ یہ کسی کی فکر کب کر سکے گا، فی الحال تو اپنی جان بچانے سے معذور نظر آتا ہے۔ اپنی عزت وآبرو اور اپنے دین ومذہب تک کو خطرے میں اور بالکل ہاتھ سے جاتا ہوا پاتا ہے۔ تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور کس چیز کی کمی نے مسلمان کو اتنا گرا دیا کہ وہ بے بس ومجبور کھڑا اقوام عالم کی گھرکیاں سہہ رہا ہے؟ اگر ہم اس نقطہ پر غور کریں تو بات ایک ہی سامنے آتی ہے کہ جب ان سارے کمالات کا سبب کمالِ یقین ہے اور کمالِ ایمان باللہ ہے، تو اسی میں کمی ہے، یا ہم سرے سے اسے کھو چکے ہیں کہ اس درجہ رسوا ہو رہے ہیں۔ تو ہم مسلمان تو ہیں، بحمد اللہ! ہم نے ایمان کھویا تو نہیں، اگر خدانخواستہ کھو چکا ہوتا تو ہم مسلمان ہی نہ ہوتے۔ پھر جھگڑا کس بات کا؟ ہم بھی دوسروں کی صف میں شامل ہو چکے ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اللہ کریم ہمیں معاف فرمائے، ہم جیسے بھی ہیں مسلمان ضرور ہیں، تو پھر کمی کیا ہے؟ میرے خیال میں ایمان تو ہے، کمالِ ایمان نصیب نہیں، یقین تو ہے مگر وہ غیر متزلزل اور کامل نہیں، اس لیے کہ یقین کامل اور مضبوط ایمان کے لیے علم کی ضرورت

ہے۔اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ذاتی طور پر اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں جانتے ہوں۔اس کی رضامندی و ناراضگی کے اسباب پہ نظر ہو،اس کی عظمت نگاہوں میں پھرتی ہو،اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف رشتۂ ایمان نصیب ہو بلکہ عشق اور جنوں کی حد تک محبت ہو،اس کی کتاب کو سمجھتے ہوں،اسے بار بار پڑھتے ہوں اور یوں اس ذات بے ہمتا سے شرف ہم کلامی نصیب ہو تو یقینِ کامل حاصل ہو اور پھر اس کی رضا کی خاطر تعمیلِ ارشاد کی فکر بھی ہو۔نیز جب اس سے پیار ہو تو لامحالہ اس کی مخلوق سے شفقت بھی نصیب ہو اور یوں ہم سب کی بہتری اور فلاح کی فکر کریں۔

عملی فیلڈ کے مسلمان:

عملی فیلڈ کے مسلمان نے تو دینی علم کو سرے سے چھوڑ ہی دیا۔دُنیا کے لیے روئے زمین کا کونہ کونہ چھان مارا اور کمالاتِ دُنیا کو پانے کے لیے گلی گلی پھرا،ملک ملک گیا اور دیس دیس دھکے کھائے،مگر نہ پڑھا تو اپنا دین۔نہ صرف یہ کہ دین پڑھا نہیں بلکہ دینی علم کا حصول نکمے پن کی دلیل بن گیا،اور یہ بہت عجیب بات ہوئی کہ جو تریاق حیات آفریں تھا وہ موت کا سبب کیسے بن گیا؟ یقیناً اس لیے کہ جب سب مسلمان دین کے علم کو چھوڑ کر کمالاتِ دُنیا کے لیے بھاگے تو ایک معذور دین کا طبقہ پیچھے رہ گیا جو اس طرح دوڑنے کی ہمت نہ رکھتا تھا،میدان عمل میں پورا نہ اترتا تھا، اور دوسری طرف دینی علم رہ گیا تو ناچار انہوں نے دین سیکھنا شروع کر دیا۔علماء سے اور علمی خانوادوں سے معذرت کے ساتھ کہ یہ علمی گھرانوں کا احسان پوری امت مسلمہ پر ہے کہ انہوں نے بھوک وافلاس کو گلے لگایا،یا بُرے پہ وقت کاٹا،تکلیفیں جھیلیں،شہروں سے نکالے گئے مگر دین کے علم کو نسلاً بعد نسلاً سینے سے لگائے رکھا اور اسے ہم تک پہنچایا۔اللہ تعالیٰ انہیں بلند درجات سے نوازیں۔میں بات اس اکثریت کی کر رہا ہوں جو مجبوراً اس پلیٹ فارم پر رہ گئے اور پھر انہوں نے دینی علم کو بطور پیشہ اپنا کر اپنا وقت بسر کرنا شروع کیا۔میدانِ عمل میں تو وہ شروع سے مِس فٹ تھے،

کام وہ کیا کرتے۔ تو یہ بات سمجھ لی گئی کہ دینی علم سے آدمی ناکارہ ہو جاتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی، یعنی دینی علم ان لوگوں نے پڑھا جو بے کار تھے۔ جیسے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا حضرت مولوی چور ہو گیا ہے، تو انہوں نے بے ساختگی سے فرمایا: نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے بلکہ چوروں نے داڑھیاں رکھ لی ہیں، ورنہ مولوی تو مولوی ہی ہے۔ دینی علم نے لوگوں کو بے کار نہیں کیا، بے کار لوگوں نے دینی علم سیکھا۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ میدانِ علم میں آج بھی ثابت ہے کہ کفار کی نسبت گنہگار مسلمان بھی زیادہ دانشمندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ ان مغربی ممالک کے تحقیقی اداروں میں بھی مسلمان سائنسدان اور مسلمان محقق ان سے زیادہ، ان سے اچھا کام کر رہے ہیں۔ مسلمان ڈاکٹر جو یہاں کام کرتے ہیں، ان میں ایسے نامور لوگ موجود ہیں جن کا مقابلہ یہ لوگ نہیں کر سکتے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کو دینی علم سے محروم رکھا گیا، فیلڈ کا کام سکھایا گیا جو انہیں بہترین انجینئر، بہترین ڈاکٹر تو بنا گیا مگر دین کے علم سے دور رہے۔ ورنہ بہت اچھے مسلمان بھی ہوتے اور یوں صرف سائنسدان یا ڈاکٹر نہ ہوتے بلکہ بہترین مسلمان ڈاکٹر یا سائنسدان ہوتے۔ وہ مساجد میں نماز کی قیادت کرتے، وہ لوگوں کو دین کی راہ بتاتے، وہ اپنے حلقہ اور اپنے لیول پر دین کی تبلیغ کرتے۔ مگر ہم نے انہیں اس طرف کا علم نہ دیا۔ اور جن کو دینی علم میں کچھ موقع ملا، انہیں نہ تو فیلڈ کا کام سکھایا گیا اور نہ وہ فیلڈ میں جا سکے۔ یوں اس تقسیم نے قومی سطح پر ہمیں بہت نقصان پہنچایا۔ تو اس کا حل آج بھی یہی ہے، اور آئندہ بھی یہی رہے گا کہ ہم دین پڑھیں اور اسے سمجھیں، اور سمجھ کر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی اولاد کو پڑھائیں تاکہ وہ بہتر مسلمان بن سکیں۔

بیان ختم ہوا تو اسی عمارت میں ظہر کی نماز پڑھی گئی اور لوگ تھوڑی دیر کے لیے رخصت ہوئے۔ شام پھر جمع ہو گئے۔ شام ڈاکٹر صاحب نے گھر پر اجتماع رکھا ہوا تھا۔ کچھ لمحے آرام کو مل گئے۔ اٹھ کر عصر ادا کی اور لوگ آنا شروع ہو گئے۔ اچھے پڑھے لکھے

حضرات بیوی بچوں کے ہمراہ تشریف لا رہے تھے کہ بہت سے لوگ مدعو تھے اور امریکہ میں لوگوں کا دینی بات سننے کے لیے جمع ہونا آسان نہیں کہ یہاں تین بہت بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اول یہ کہ ایک طبقہ بہت امیر ہے اور دولت مندی کے ساتھ امریکنائزڈ بھی ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ پاکستان سے ہی آئے تھے مگر اب اس تبدیلی کی زَد میں آکر مزاجاً بھی اور عملاً بھی دین سے بہت دور ہو چکے ہیں، حتیٰ کہ بیٹی سولہ سال کو پہنچے تو اس کی سویٹ سکسٹین (Sweet Sixteen) مناتے ہیں۔ یہ امریکی لوگوں کی ایک دعوت ہوتی ہے جس میں بیٹی کو بھڑکیلا لباس پہنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ کوئی جوان اس سے دوستی کر لے۔ اور اسی طرح ماموں بھانجی کے ساتھ یا چچا بھتیجیوں کے ساتھ ڈانس کرنا عجیب نہیں جانتا۔ حرام گوشت بے تکلف کھایا جاتا ہے، وہ خواہ کسی طرح کا ہو۔ اور اس کے ساتھ دوسری مصیبت یہ ہے کہ عموماً یہ بہت پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں لہٰذا مُلا کی بات سننا اپنی شان ہی کے خلاف تصور کرتے ہیں کہ مولوی ان کے نزدیک ان پڑھ ہوتا ہے۔ اور تیسری مصیبت یہاں کی مصروف ترین زندگی ہے جس میں لوگوں کو دم لینے کی فرصت نہیں ہوتی۔ دوسرا طبقہ جو بہت امیر نہیں، انہیں تو رات دِن کی مزدوری نے دُنیا و آخرت، ہر دو عالم سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ کام، کام اور کام ہی ان کی زندگی ہے۔ چند لمحے دم لینے کو ملیں تو دھڑام سے بستر پر گر جاتے ہیں۔ اور بہت کم لوگ ہیں جو دینی بات سننے کے لیے بھی وقت نکالتے ہیں۔ ہاں! ایک بات بہت حوصلہ بخش ہے کہ اب لوگوں میں ایک جذبہ بیدار ہوتا دکھائی دیتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ لوگوں نے کچھ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اب وہ کبھی علماء پر، کبھی سیاستدانوں پر اور کبھی پیروں پر بڑی سخت تنقید کرنے لگے ہیں کہ یہ سب لوگ قوم کی رہنمائی کرنے کی بجائے اسے تباہ ہوتا نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ اس کی تباہی میں برابر کے شریک جرم ہیں۔ اور یہ بہت اچھی صورتحال ہے۔ یہ سب ہنگامہ آخر نہیں درست مقام پر لے جائے گا اور مسلمانوں کو یقیناً یہ احساس نصیب ہوگا کہ ہم سب کی کوتاہیاں اور

دین سے بے خبری ہمارے دینی اور قومی زوال کا سبب بن رہی ہے اور اسی حقیقت کے جاننے کی ضرورت ہے۔ خیر یہ تو ایک عام تجزیہ تھا کہ ملک بھر میں لوگوں کی حالت کیا ہو رہی ہے۔ اس سب ہنگامے میں اہلِ دل مسلمانوں کی کمی بھی نہیں جو واقعی کچھ کر گزرنے کو بے تاب ہیں اور کسی رہنما، کسی تحریک کے منتظر ہیں۔ اللہ کرے اب مسلمانوں کا بحیثیت قوم تبدیلی کا عمل شروع ہو، مثبت اور بہتر تبدیلی جو اس قوم کو پھر سے اقبال مندی کی مسند پر بٹھا سکے، آمین۔ تو جناب لوگ جمع ہوتے گئے اور مغرب کا وقت بھی آ گیا، مل کر باجماعت نماز ادا کی گئی اور پھر محفل شروع۔ سوالات کا ایک چھوٹا سا چارٹ بنایا گیا، یا چٹ کہہ لیجیے، بہر حال مندرجہ ذیل سوال تھے۔

(1) پیری مریدی
(2) حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(3) کشف والہام
(4) ذکر
(5) ارواح سے ملاقات
(6) لوحِ محفوظ اور علمِ غیب
(7) نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

یہ تو پرچہ تھا، اب مجھے اس پہ جواب دینا تھا۔ سو بتوفیق الٰہی ابتداء کی، جو ہر حال کرنا ہی تھی۔

اسلام محض روایات کا مذہب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بھی آسمانی مذہب محض روایات تک محدود تھا۔ چونکہ روایات اور بات تو محض ذہن و عقل تک رسائی رکھتی ہے، مگر آسمانی مذاہب کے ساتھ کیفیات بھی تھیں۔ جیسے ہر کلام کرنے والے کی ذات کا ایک اثر اس کے کلام میں ہوتا ہے، ویسے ہی ذاتِ باری کی تجلیات اس کے ذاتی کلام کا خاصہ ہوتی ہیں، اور

یہی نور سب آسمانی مذاہب کی جان تھا۔ جب کسی بھی آسمانی مذہب کا عہد پورا ہوا تو اس میں سے یہی کیفیت اٹھالی گئی، لہٰذا اس پر عمل درست نہ رہا۔ اور اسی سبب کلامِ الٰہی کا نزول آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پہ ہوا کہ کلام کی بنیاد یہ تجلیات اور نورانی کیفیات تھیں۔ اب جسے ایمان نصیب ہوا تو ایمان کے ساتھ تصدیقِ قلبی کی شرط ہی ظاہر کرتی ہے کہ اس کے قلب اور نہاں خانۂ دل نے بات کو قبول کیا۔ تو گویا کلمہ ادا کرتے ہی اس کے دل میں یہ نور بھی سرایت کر گیا اور یہ نعمت ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ اب جوں جوں وہ اطاعت کرتا ہے، اسی نورِ قلب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مگر کچھ لوگ اس میں بہت آگے نکل گئے اور ان کے قلوب ایک دم سے بہت زیادہ روشن ہو گئے حتیٰ کہ وہ دو عالم کو بھول گئے اور صرف اور صرف اللہ کی ذات کے طالب بن گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو ایمان کے ساتھ آپ ﷺ کی صحبت بھی نصیب ہوئی اور وہ صحابیؓ کہلائے۔ جو لوگ شرفِ دیدار اور فیضِ محبت سے بہرہ ور نہ ہو سکے، نورِ ایمان تو انہیں بھی پہنچا۔ وہ محقق، مفسر، مجاہد اور ولی اللہ تو بن سکے مگر صحابیؓ نہ بن سکے کہ اس کے لیے براہِ راست ملاقات ہی سبب تھی۔ قلب رسول اللہ ﷺ سے ایک خاص نور قلب مومن میں منعکس ہو کر اسے مقامِ صحابیت پہ فائز کر دیتا تھا۔ اور یہ بھی یاد رہے، بلکہ خاص طور پر یاد رکھنے کی چیز ہے کہ یہ نور انہیں صرف اللہ سے محبت ہی نہیں دیتا بلکہ معاملات و تجارت، سیاست اور جہاد جو بھی ہوں، ان میں بھی دوسرے سے بہت بلند اور اعلیٰ شعور اور قوتِ کار بخشتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ہر پہلو سے دُنیا کی قیادت حاصل کر لی۔ فتوحات بے مثال، کردار بے داغ اور سیاسی اہتمام اور حکومتی نظام بے نظیر ٹھہرا۔ اب یہ نبوت آخری، دین آخری اور کتاب آخری تھی، لہٰذا اس کتاب کی حفاظت کا ذِمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے لیا اور ایک بظاہر محال بات کہ کوئی بھی کتاب صدیوں اسی حال میں رہے جس طرح روزِ اوّل تھی، خصوصاً جبکہ ایک بہت بڑا طبقہ اس میں ملاوٹ کرنے میں کوشاں بھی رہا ہو، آج بھی ہمارے سامنے ہے کہ وہ کتاب اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ

موجود ہے۔ اسی طرح وہ نورِ قلب بھی نسلاً بعد نسلاً آگے منتقل ہوتا رہا۔ صحابہؓ سے ملنے والے تابعی کہلائے اور تابعین کی صحبت پانے والوں کو تبع تابعی کہا گیا۔ اب یقیناً جو قوت آپ ﷺ کے قلبِ اطہر کی تھی وہ صحابہؓ کی نہ تھی، جو صحابہؓ کی تھی وہ آگے کم ہوئی اور تبع تابعین کے بعد اب صرف ایک نگاہ کافی نہ رہی بلکہ باقاعدہ مجالس میں بیٹھ کر اور وقت لگا کر توجہ حاصل کرنے اور اس کو قلوب میں جمع کرنے کی کوشش کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ جس طرح ہر شعبے میں کمال حاصل کرنے والے بطور اساتذہ دوسروں کے لیے اس علم کے حصول کا سبب بنے، کوئی مفسر کہلایا تو کوئی محدث یا فقیہہ۔ اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے علومِ ضروریہ بھی بدرجہء کمال حاصل کیے اور پھر ان لوگوں کی خدمت میں رہے جن سے قلبی نور حاصل کیا، انہوں نے دوسرے لوگوں تک اسے پہنچایا۔ اس شعبے کے اساتذہ، پیر کہلائے اور ان سے یہ روشنی حاصل کرنے والے مرید۔ پیر حضرات علمِ دین اور خوبصورت عملی زندگی رکھتے تھے جو ان کے قلب کے نور پر گواہ اور مریدان سے قلبی قوت اور نور پا کر بہتر مسلمان اور بہترین انسان بن سکتے تھے۔ یہ پیری مریدی کی اصل تھی۔ اب اگر اسے پیشہ کے طور پر نقالوں نے اپنا لیا تو قصور ان کا ہے، اس میں اس شعبے کو بدنام کرنا درست نہیں، اب آپ کا دوسرا سوال ہے حیات النبی ﷺ، تو حیات کے لیے پہلے موت کو جاننا ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے دو شعبے یا حصے ہیں۔ ایک حصہ دُنیاوی زندگی کا ہے جہاں اس کے گرد اک جہان سجا کر اسے ضرورتوں سے لاد دیا گیا ہے اور خود اس کے اور جہان کے مالک نے اسے دُنیا کو برتنے کا سلیقہ اور قانون دیا ہے۔ لہٰذا اس مختصر سی زندگی میں اسے اللہ کی اطاعت کرنا ہے اور اس کے بعد موت کا ایک عجیب موڑ ہے جو سب کو اس زندگی سے آگے لے جاتا ہے۔ دُنیا میں بدن مکلف بالذات تھا، روح اس کے تابع۔ موت روح کو سامنے لے آتی ہے اور بدن اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں رنج و راحت بدن پاتا ہے اور اس کے واسطے سے روح۔ لیکن دُنیا سے آگے برزخ میں رنج و راحت روح پاتی

ہے اور اس کے بدن کے ہر ذرے کا تعلق اس سے ہوتا ہے جو اپنا حصہ پاتا رہتا ہے۔ پھر قیامت قائم ہوگی تو ایسی زندگی شروع ہوگی کہ روح اور بدن دونوں برابر رنج و راحت پا سکیں گے۔ کسی نے نافرمانی کی تو انجام رنج، اور اطاعت کا انجام راحت ہوگا۔

موت کی حقیقت:

موت کو کتاب اللہ کی روشنی میں دیکھیں تو اس میں بہت فرق نظر آتا ہے، جیسے کافر کی موت مختلف انداز میں وارد ہوتی ہے اور مومن کی دوسرے انداز میں۔ پھر مومنین کے درجے ہیں، حتیٰ کہ ایک موت شہید کی ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو کہ وہ زندہ ہیں اور عملی طور پر شہدا کی قبریں کھلیں تو دیکھا گیا کہ ان کے بدن تروتازہ تھے، یعنی موت کے بعد روح کا تعلق بدن سے اتنا مضبوط تھا کہ اسے مردہ کہنے سے روکا گیا اور وہ زندوں کی طرح تروتازہ بھی رہا۔ شہدائے احد کی قبریں تقریباً چالیس برس کے بعد کھولی گئی تھیں اور انہیں موجودہ جگہ دفن کیا گیا۔ 1976ء میں مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلہ میں بعض صحابہؓ کی قبریں کھولی گئیں جو مقتول نہ تھے مگر وجود تروتازہ تھے، جنہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ یہ سب رتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے طفیل نصیب ہوا۔ تو خود نبی پر جب موت آتی ہے تو اس کی روح مبارک کو بدن سے جدا کیا ہی نہیں جاتا بلکہ روح کا وہ تعلق جو امورِ دُنیا، کھانے پینے، سونے جاگنے، گرمی سردی سے تھا، روک دیا جاتا ہے۔ اور اس کا یہ تعلق عالم برزخ سے قائم ہو جاتا ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، جیسے کسی روشن چراغ پر پردہ سا ڈال دیا جائے، اسے بجھایا نہ جائے۔ ایک خوبصورت بات علامہ خالد محمود نے کہی تھی کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر نیک آدمی کی روح دُنیا سے جانے کے بعد دُنیا سے بہتر مقام پر ہوتی ہے اور جتنا کسی کا درجہ بلند ہوتا ہے اتنا اعلیٰ مقام پاتی ہے، اور روحِ اطہر کے لیے سب سے اعلیٰ مقام صرف اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ہے کہ دوسرا کوئی ٹھکانہ اتنا مبارک نہیں ہو سکتا، ربِّ جلیل نے پیدا ہی نہیں فرمایا ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وصال

ہوا، جنازہ مبارک ہوا، قبرِ اطہر بنی مگر صرف عالم بدلا، حیات کی کیفیت تبدیل نہ ہوئی۔آپ روضۂ اطہر کے اندر قبرِ مبارک میں اسی طرح زندہ ہیں، جیسے دُنیا میں تھے۔فرق صرف عالم کی تبدیلی کا ہے۔یہ دُنیا تھی، وہ برزخ ہے۔اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دور سے درود پڑھا جائے تو مجھے فرشتے پہنچاتے ہیں اور قبرِ مبارک پر اور روضۂ اطہر کے سامنے آکر پڑھا جانے والا میں خود سنتا ہوں۔بہر حال یہ مختصری بات تھی جو عرض کی جاسکی۔

اب آپ کے بہت سے سوال یکجا ہو سکتے ہیں مثلاً کشف و الہام، ارواح سے ملاقات، لوحِ محفوظ اور علمِ غیب۔تو سنیے حضور! علمِ غیب کی تعریف یہ ہے کہ بغیر کسی واسطہ کے ملے، اگر کوئی واسطہ درمیان آیا تو وہ غیب کا علم نہ ہوگا۔جیسے آپ کو دور دراز کی خبر فون پر ملی تو یہ علمِ غیب نہ رہا۔لہٰذا بغیر کسی سبب اور ذریعے کے جاننا یہ صرف اللہ کریم کا خاصہ ہے لہٰذا غیب کا علم صرف اللہ کے لیے ہے۔اور کشف و الہام وہ ذرائع ہیں جن سے اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف سے اطلاع نصیب ہوتی ہے، اور دوسروں کے کشف و الہام اگر وحی کے مطابق ہیں تو درست، اگر اس سے ٹکرائیں تو انہیں غلطی لگی ہے۔لہٰذا حق وحی کے ساتھ ہے۔اب اللہ چاہے تو کشف میں لوحِ محفوظ دکھا دے یا دو عالم، یہ اس کی مرضی، اور جس چیز پر پردہ ڈال دے، وہ قادر ہے۔آپ ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں دیکھ سکتے ہیں کہ ارشاد ہے: ابراہیم کو ملکوت السمٰوٰت والارض دکھا دیئے، مگر وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام قربانی کے وقت نہ جان سکے کہ بیٹا ذبح نہ ہوگا، بلکہ اللہ کریم اس کی جگہ دنبہ بھیج دیں گے، ورنہ تو قربانی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔آپ جس کو بھی کہہ دیں کہ ذبح تو دنبہ کریں گے، آپ ذرا دکھانے کو بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دیں، تو وہ ایسا کر سکے گا۔اور ملاقات رسالت مآب ﷺ کے دو پہلو ہیں؛ کسی پر آپ ﷺ شفقت فرمائیں، اللہ کی رحمت ہو، اسے خواب میں زیارت ہو جائے، یا جاگتے میں نصیب ہو، تو یہ بھی کشف اور خرقِ عادت ہی کی ایک صورت ہے۔یا پھر اسے کسی ولی کامل سے

نورِ قلب نصیب ہو اور روحانی نور پر ترقی کرتا ہوا اس مقام کو پالے کہ وہ روحانی طور پر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو سکے، تو یہ سب ممکن ہے، اور اتباعِ سنت کے ساتھ مجاہدہ اور صحبتِ شیخ کا متقاضی ہے۔ رہا یہ جملہ کہ ''نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''، تو میری دانست کے مطابق اس کا اطلاق بھی شیخ کامل پہ ہوتا ہے، اور تقدیر سے مراد اللہ کی اٹل تقدیر نہیں بلکہ طریقِ حیات ہے اور کاملین کی توجہ سے عملی زندگی یقیناً بدل جاتی ہے اور آخر میں ذکر۔ تو ذکر اللہ کا حکم قرآن وسنت میں موجود ہے۔ کرنے کے بے شمار فوائد، اور نہ کرنے کے بے پناہ نقصانات کا تذکرہ ہے۔ قبولِ ایمان ذکر کا ادنیٰ درجہ ہے، پھر سنت کے مطابق ہر عمل، عملی ذکر کہلاتا ہے۔ اس سے ترقی کر کے تلاوت و تسبیحات ذکرِ لسانی کہلاتا ہے، اور سب سے اعلیٰ ذکرِ قلبی ہے جو دل کرتا ہے اور اس کے ساتھ سارا وجود کرتا ہے۔ ذکر کی کثرت کا حکم ہے، کوئی وقت اور کوئی طریقہ اور حالت معین نہیں کی گئی۔ لہٰذا کوئی کسی حال میں کرے جائز اور درست ہے، بشرطیکہ اس طرح کرنے میں کسی بھی دوسرے شرعی حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو، لہٰذا مختلف بزرگوں اور کاملین نے اپنے اپنے تجربے سے ذکر کے مختلف انداز اپنائے۔ اللہ کے ذاتی نام کا ذکر کرنے کا حکم ہے، اور ذکر کر کے قربِ الٰہی کی تلاش سب کا مقصد۔ لہٰذا جو جیسے کرے وہ اس کا کام ہے، ہاں! خلافِ شریعت کوئی کام نہ کرے۔ مشائخ عظام اور اساتذہ کرام نے ذکر قلبی کا جو طریقہ پسند فرمایا اسے پاس انفاس کہتے ہیں، یعنی اپنے ہر سانس کی نگرانی اس انداز میں کہ ہر سانس میں اللہ کا ذکر ہو۔ اس سے جب توجہ نصیب ہوتی ہے تو دل ذاکر ہو کر عملی زندگی میں بھرپور انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ سب لوگ بایزید بسطامی (رحمۃ اللہ علیہ) تو نہیں بن جاتے، مگر نیکی میں رغبت اور برائی سے نفرت ہر ایک کو نصیب ہوتی ہے۔

یہ اس ساری بحث کا خلاصہ تھا جس میں دورانِ گفتگو ہر موضوع پر مختلف سوالات ہوتے رہے، جو سب تو مجھے یاد نہ رہے، ہاں! ایک بڑی بات کہ مریدی، شیخ کے ارادہ اور خواہش کے سامنے مکمل طور پر جھک جانے کا نام ہے؟ پر میں نے عرض کیا کہ اسلام اللہ کی

اطاعت کا نام ہے اور شیخ اللہ کی اطاعت کرنے کے لیے نہ صرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ دل میں اطاعت کا جذبہ بھی ابھارتا ہے۔ لہٰذا اسے یوں کہا جائے کہ اللہ کی رضامندی کے لیے شیخ سے راہنمائی لے کر خلوص سے عمل کی کوشش کرنا مریدی ہے تو زیادہ درست ہوگا۔
سوالات تو اور بھی تھے مگر سب یاد نہ رکھ سکا، پھر تھوڑی دیر ذکر کیا اور یوں رات ایک بجے کے لگ بھگ یہ محفل اختتام پذیر ہوئی۔ کھانا کھا کر کچھ کمر سیدھی کی تو تہجد کا وقت ہوگیا۔ اُٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ذکر کیا اور ناشتہ کر کے ایئرپورٹ چل دیئے کہ مجھے واشنگٹن ڈی سی جانا تھا، جہاں ہمارے ساتھی کرنل صاحب اور فیض چوہدری صاحب کے ہاں بذریعہ کار پہنچ رہے تھے، اور شام کو اجتماع تھا جس میں بیان کرنا تھا اور پھر محفلِ ذکر۔

ورجینیا ایئرپورٹ:

جہاز ہمیں پھر سے لے اُڑا اور ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر شاید ساڑھے دس بجے، واشنگٹن ڈی-سی جا پہنچا۔ یہ شہر امریکہ کا دارالخلافہ ہے۔ شہر تو مرکزی حکومت کی ملکیت ہے مگر ایک طرف میری لینڈ ریاست کی حد ہے اور دوسری طرف ورجینیا کی۔ چوہدری صاحب ورجینیا میں رہتے ہیں۔ میں جہاز سے اُترا اور باہر کو چلتا آیا۔ میزبان نظر نہ آرہے تھے، باہر سڑک کنارے آکر کھڑا ہوگیا کہ شاید ابھی پہنچے نہ ہوں گے، کچھ پریشان بھی ہوا اگر یہاں کی ٹریفک میں بھیڑ کا عمل بھی تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ ایک سیاہ گاڑی سے ایک خاتون کو اترتے دیکھا۔ ادھیڑ عمر کی یہ معزز خاتون لون کی شلوار قمیص پر پورا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ پولیس والے نے گاڑی کھڑی کرنے سے منع کیا تو اس نے کچھ کہا۔ تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور میرے پاس آکر پوچھا:

آپ مولانا اکرم صاحب ہیں؟ جی خاتون۔ میں مسز چوہدری ہوں۔ آیئے، وہ آپ کو لینے اندر گئے تھے کہیں بھول گئے ہوں گے۔ میں ان کے ساتھ آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں چوہدری صاحب بھی پریشان سے باہر آئے تو انہیں اشارے سے بلایا گیا۔ بہت خوش ہوئے، بتانے لگے کہ میں اندر پہلے ایک اور طرف چلا گیا تھا کہ بہت

کشادہ اور لمبے چوڑے ایئر پورٹ ہوتے ہیں اور متعدد جہاز ایک وقت میں آ جا رہے ہوتے ہیں، لہٰذا ایسا ہو جانا بڑی بات نہیں۔ ہم گھر پہنچے تو کرنل صاحب اور فیض دورا تیں اور پورا دِن راستہ میں لگا کر ڈیڑھ ہزار میل مزید سفر کر کے وہاں پہنچ گئے، اور یوں ہمارا قافلہ پھر سے یکجا ہو گیا۔ دِن بھر خوب آرام کیا جو بہت عرصہ کی مصروفیت کے بعد نصیب ہوا تھا، اور عصر کے بعد لوگ آنے شروع ہو گئے۔ پھر وہی سلسلۂ ملاقات، تعارف، تقریر اور سوال و جواب، بہر حال کچھ وقت ان لوگوں کی بات سننے میں بھی لگا کہ انتظار ہو رہا تھا کہ لوگ آ رہے ہیں۔ اور یوں مغرب قریب ہو گئی، تو چوہدری صاحب فرمانے لگے کہ اب نماز تک انتظار کر لینا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ ہم بیٹھے سنا کیے، لوگ بھرے بیٹھے تھے اور شاید انہیں اس طرح مل بیٹھنے کو بھی کم وقت ملتا ہو گا، لہٰذا اپنے اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کر رہے تھے۔ جس میں زُور مولوی پر تھا کہ مولوی صاحبان چندہ کھا گئے، مولوی صاحب اتفاق نہیں کرتے اور ہمیں تقسیم کر رکھا ہے۔ مولوی صاحب کا لباس عجیب ہے، اور وہ انگریزی نہیں بولتے، ان کی کون سنے گا۔ زیادہ شور فنڈز کے خُرد بُرد پر تھا، حتیٰ کہ مغرب کا وقت ہوا۔ سب نے مل کر مغرب کی نماز ادا کی جو ایک مقامی مولوی صاحب نے پڑھائی، جو از راہِ شفقت تشریف لے آئے تھے، اور اس کے بعد تھوڑی دیر بیان ہوا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ اسلام ایک ہمہ گیر عالمی اور عملی مذہب ہے۔ اس نے مسلمان کو صرف طریق عبادت ہی نہیں دیا، دُنیا کی ہر ضرورت اور ہر شعبے میں ان کی بہترین رہنمائی فرمائی۔ حتیٰ کہ دورِ اوّل کے مسلمان جہاں نیکی اور دین کے علم میں مثالی تھے، وہاں مثالی تاجر، مثالی سیاستدان اور مثالی سپاہی بھی تھے۔ ان کی فتوحات اور انتظامِ سلطنت ان کی بے مثال قیادت پہ گواہ ہے۔ یقیناً ان لوگوں نے کسی غیر ملکی ادارے سے کچھ نہ سیکھا تھا، بلکہ انہیں ان کے دین نے ہی سب کچھ دیا، اور سارے کمال توجہاتِ نبوی کے طفیل نصیب ہوئے تھے۔ چنانچہ جب تک اقتدار اور دین کو الگ نہ کیا گیا، مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی۔ حتیٰ کہ زمانے نے کروٹ لی اور دُنیا کے عہدے دینی علم رکھنے والوں سے خالی ہونے لگے۔

تاریخ پر ایک نظر:

مسلمان حکمران دینی علم سے بیگانہ ہوئے تو سارا حکومتی نظام دین سے الگ کرلیا۔ حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے زمانہ اس دور کو پہنچا کہ وسط ایشیا سے منگول اٹھے اور مسلمانوں پر طوفان بن کر چھا گئے۔ مسلمان سلطنتوں کے پرخچے اُڑا دیئے اور زمین کو خون سے سرخ کردیا۔ جب تاتاری شہر کے باہر اپنا گھیرا مکمل کر رہے تھے، بغداد کے اندر گلیوں میں مختلف موضوعات پر مناظرے ہو رہے تھے۔ سلطنت خوارزم کو تاراج کرنے کی اجازت خلیفہ بغداد نے دی تھی، بالکل اسی طرح جیسے آج عراق کی تباہی کی دعوت سعودی حکومت نے دی ہے۔ مگر پھر تاتاری وہاں نہ رکے اور بغداد کی باری بھی بہت جلدی آ گئی۔ جس کی تابوت میں آخری کیل ابن علقمی نے ٹھونک دی جو شیعہ تھا اور سلطنت بغداد میں کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ علاوہ دوسری بربادیوں کے، کتابوں کی اتنی بڑی تعداد دریا میں پھینکی گئی کہ دجلہ کا پانی بغداد سے گزرتا تو سیاہی مائل ہو جاتا اور یہ سیاہی مسلسل چھ ماہ پانی میں گھل گھل کر بہتی رہی۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اسلام کا کچھ نہ بگڑا اور اللہ نے تاتاریوں کو ایمان کی توفیق عطا کردی، جس پر کہا گیا کہ:

؎ پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

پھر ہم یہ حال دیکھتے ہیں کہ تاتاری سلطانوں نے پھر سے دین کا علم، ترقی کی شرط رکھا، اور مسلمان جرنیل دینی عالم بھی ہوتے تھے۔ یوں اسلام پھر سے معزز ہوا اور مسلمان ریاستوں کو عروج نصیب ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ بات پھر بگڑنے لگی تو مغرب میں عثمانی خلافت کمزور پڑنے لگی، اور مشرق میں سکھوں تک نے اقتدار چھین لیا، اور پھر مغربی طاقتیں اپنا رنگ جمانے لگیں۔ عثمانی خلافت ختم کر کے اقتدار ایسے لوگوں کو سونپا گیا جو مغرب کے دلدادہ اور نام کے مسلمان تھے اور برصغیر میں دین کا علم رکھنے والوں پر دُنیا کی ترقی کے دروازے بند کردیئے۔ تب ہی یہ کہاوت بنی تھی کہ ''دیکھو قدرت کے کھیل، پڑھیں فارسی بیچیں تیل''۔ چنانچہ کام کرنے والا طبقہ دین چھوڑ کر ان علوم کو لپکا جو دُنیا کی ترقی کے لیے

ضروری تھے، اور یوں مسلمان کی دُنیا دین سے دور ہونے لگی۔

کیا دین ہمارا اپنا مسئلہ ہے:

آج ہم اس حال کو پہنچے ہیں کہ کام کرنے والا طبقہ دین سے دور، اور دینی علم رکھنے والے لوگ کام سے دور ہیں۔ جب انہیں کام بھی نہیں کرنا اور دین ہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے تو یہی صورتحال ہوگی جس پر آپ خفا ہو رہے ہیں۔ ہم نے اپنا ناکارہ طبقہ دین کو دیا، انہیں نفرت کی فضا میں پالا اور وہ خیرات مانگ مانگ کر پلے بڑھے۔ اب انہیں اگر کچھ اختیار ملا تو یقیناً ان کا مزاج انتقامی ہونا چاہیے، جس پر آپ لوگ خفا ہو رہے ہیں کہ آپ نے دین اور دینی علم کو دیا کیا ہے؟ آپ اپنے بچوں کو دین کیوں نہیں پڑھاتے؟ سائنسدان اور ڈاکٹر بننے والے بچے کیوں دین نہیں پڑھتے؟ آپ خود دین کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ تو اللہ کریم کا احسان ہے کہ دین کی بقاء کے لیے اس نے ایسے علمی گھرانے پیدا فرما دیئے جنہوں نے زندگی کی راحتیں قربان کر کے دین کو سینے سے لگایا اور اسے آگے پہنچانے کا خوبصورت نورانی سبب قرار پائے۔ ہم ان حضرات کو صرف احترام تک بھی نہ دے سکے، تو پھر شکوہ کس بات کا؟ اور شکایت کیسی؟ آیئے! ہم اسلام کو اپنا ذاتی مسئلہ جاننا شروع کریں۔ اس کی اہمیت کا احساس کریں اور دینی علم خود بھی حاصل کریں اور اپنی اولاد کو بھی دین کا علم سکھانے کا اہتمام کریں تا کہ ہمارے ڈاکٹر، انجینئر اور سیاستدان دین کے خادم، بہترین مسلمان اور بہترین انسان بھی بن سکیں۔

اس کے بعد کھانا ہوا جو چوہدری صاحب نے بہت فراخدلی اور مشرقی خوبصورتی سے تیار کر رکھا تھا۔ اس کے بعد عشاء کی نماز ہوئی اور احباب نے مل کر ذکر کیا۔ کہ بالٹی مور اور میری لینڈ سے بھی ساتھی آگئے تھے اور یوں حسب معمول رات کا ایک بج چکا تھا۔ کچھ دیر آرام کیا۔ صبح ذکر کے بعد نماز ہوئی، گھر والوں نے ناشتہ تیار کر دیا اور یوں علی الصبح ہم سب کار کے ذریعہ نیویارک روانہ ہوئے اور دوپہر تک نیویارک پہنچ گئے۔ چونکہ گزشتہ دو ہفتے ہم نے اس قدر سفر میں گزارے کہ امریکہ کے اندر اندر ہمارا سفر چھ ہزار پانچ سو میل ہو چکا

ہے، جس میں ڈیڑھ ہزار میل سے زائد میں نے اور پانچ ہزار میل کرنل صاحب اور فیض احمد نے سڑک اور کار کے ذریعے سفر کیا ہے۔ ہر جگہ نئے لوگوں سے ملاقات، تقریر، بیان، سوالات اور پھر عجیب بات یہ کہ اس ملک کے اندر اندر تین گھنٹے وقت کا فرق ہے جو آپ کے کھانے اور سونے کے اوقات کی کوئی ترتیب نہیں بننے دیتا۔ اس سب مصروفیت کے ساتھ یہ ٹوٹے پھوٹے حروف بھی لکھے جاتے رہے اور یوں یہ حکایت آپ تک پہنچ پائی ہے۔ اب یہاں دو روز قیام تھا لہٰذا کینیڈا نہ جا سکے، بلکہ احباب کو یہاں آنے کی دعوت دی جس میں کچھ یہاں تشریف لے آئے ہیں۔ کل کا دن اور ہے، پرسوں شام یہاں سے سوار ہوں گے اور صبح دم انشاء اللہ لندن جا اتریں گے، جہاں نمازِ عید پڑھیں گے۔ چند یوم برطانیہ میں قیام ہوگا اور پھر بندہ چھبیس کو سوار ہو کر دوبئی جانے کا پروگرام رکھتا ہے۔ فیض اور کرنل صاحب ستائیس کو سوار ہو کر اسلام آباد جائیں گے اور مجھے شاید دو جولائی کو اسلام آباد کی پرواز لے جائے گی۔ اور یوں یہ سفر ایک بار ختم ہوگا، جو بہت جلدی دوبارہ شروع ہونے کا ارادہ رکھتا ہے کہ دعا ہے اللہ کریم ہمیں دارالسلام نیو میکسیکو کو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لیے پھر سے زندہ کرنے اور چلانے کی توفیق بخشے، جس کے لیے امریکہ بھر کے جتنے شہروں میں جانا ہوا، وہاں کے سب دوست بھی اصرار کر رہے ہیں۔ لہٰذا امید غالب ہے کہ ہم ستمبر کا مہینہ شاید پھر اسی ملک کی نذر کریں اور اب اجازت۔

والسلام ...

فقیر محمد اکرم اعوان

نیویارک۔ امریکہ

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

دارالعرفان: 30-6-1991

ایک بار پھر حاضر ہوں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے عجیب آدمی ہے، چلا جاتا ہے اور پھر آ دھمکتا ہے، مگر میرا بھی آخر کون ہے جسے دل کا حال سناؤں۔ اللہ کریم نے آپ ہی

لوگوں کو تو میرا درد بانٹنا ہے تو حالِ دل سن کر اس میں اور کسک پیدا ہو گی اور هو المقصود
تو حضور! ہم 21-جون مغرب کے وقت نیو یارک سے اُڑے، اور اُڑتے ہوئے جہاز سے ڈوبتے سورج کو دیکھا اور پھر سمندر کی بے پناہ وسعت تھی۔ اس پر چھائے ہوئے بادل اور اوپر گہری رات کی خوبصورت دراز زلفیں جن میں جہاز ہمیں لوریاں دے رہا تھا۔ کتنا خوبصورت لمحہ تھا، جس کی صبح عید قربان تھی اور ہم تنہا اور خلا کی وسعتوں میں۔ بہر حال بہت جلدی صبح ہو گئی اور ہم نے ابھرتے سورج کو کاغذ پر نقش کرنے کی کوشش کی اور یوں ناشتہ سے فارغ ہو کر 7:40 پر علی الصبح لندن کے ہوائی اڈے پہ اتر گئے۔ یہ تو کرسمس والوں کا ملک ہے، یہاں عید قربان کیسی؟ اور رہے مسلمان، تو وہ یہاں بنیادی طور پر دولت کمانے آئے ہیں، دین پھیلانے نہیں۔ ہاں! کبھی کبھی انہیں کفار کی کج ادائیاں کچوکہ دے جاتی ہیں، بیچارے تڑپتے ضرور ہیں مگر پھر کسی پیر یا مولوی صاحب کی تھپکی انہیں سلا دیتی ہے، کہ صاحب آرام کرو، ہمیں پاؤنڈ دو اور دیکھو ہم یہاں دین کی کس قدر حفاظت کرتے ہیں۔ یوں وہ بھی دولت کماتے ہیں اور دین کو دعا دیا کرتے ہیں کہ اگر دین نہ ہوتا تو ہمیں کون موج کراتا۔ بہر حال وہی ننگی اور برہنہ سی مخلوق، جسم پر جنگلیوں کی طرح چند چیتھڑے لپیٹے ہوئے، چھوٹے بڑے مرد و زن سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے، اداس اور ویران چہرے، پھٹی پھٹی آنکھیں اور مصروف زندگی۔

باہر آئے تو ساتھی منتظر تھے، ان کے ہمراہ ایک عزیز کے گھر پہنچے جہاں ہم سب کو نمازِ عید ادا کرنا تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر ناشتے کا اصرار کیا تو کہا: بھئی! پہلے غسل کر کے عید کی نماز ادا کریں اور پھر کھانا پینا۔ چنانچہ غسل کیا، ساتھی نئے کپڑے لائے تھے مگر واہ ری پردیس کی عید کہ وہ بھی چھوٹے نکلے اور انہی پہلے والے کپڑوں میں ایک مسافر اور قدرے رنجیدہ سی عید ادا کی، خطبہ دیا اور دعا کی۔ ملنے والے لوگ جمع ہونے لگے، کچھ خواتین بھی تھیں، جن میں ایک خاتون یورپین بھی تھی جسے پچھلے دورۂ برطانیہ میں ذکر کرنے کا طریقہ بتایا تھا اور اس کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی تھی، برطانیہ کی ایک مشہور تجارتی

فرم میں اچھے عہدے پر کام کرتی ہیں۔

ذکر کی افادیت پہ تھوڑا سا بیان ہوا، پھر ذکر کیا۔ اور یوں ہم فارغ ہو کر بریڈفورڈ جانے کو تیار ہو گئے تو اس خاتون نے بھی پوچھا کہ کیا میں وہاں آسکتی ہوں؟ ضرور آیئے! تو کہا: میں صبح آجاؤں گی۔ ہم پچھلے پہر پہنچے اور سو گئے۔ رات اجتماع ہوا، بیان اور ذکر ہوا۔ اور دوسرے روز وہ خاتون بھی پہنچ گئی، اس نے کہا: میں نے سیرتِ نبوی، لائف آف محمد ﷺ پڑھی ہے اور بہت سا حصہ قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے، نیز ذکر نے میرا دل بدل دیا ہے اور بہت آہستہ آہستہ میں بدل گئی ہوں۔ پہلے جو چیزیں پسند تھیں اب اچھی نہیں لگتیں، اور جو کام پسند نہ تھے، اچھے لگتے ہیں۔ القصہ! وہ کہنا یہ چاہتی تھی کہ کیا میں بھی مسلمان ہو سکتی ہوں؟ اور اگر ہو سکتی ہوں تو کیسے؟ بھئی واہ! اللہ کریم نے ہمیں عید کی سی خوشی عطا کر دی۔ ایک نہایت ذہین، قابل، کئی مضامین میں ڈاکٹر اور یورپ کی چھ زبانوں پہ عبور رکھنے والی اس خاتون نے کلمہ شہادت پڑھا، تو واقعی سب احباب کی عید ہو گئی۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

امریکہ میں ڈاکٹر فاروق عبدالحق جو مقامی اور مانے ہوئے سکالر ہیں اور یورپ میں یہ خاتون، ان شاء اللہ ایک دینی انقلاب کی بنیادی سل (Brick) ثابت ہوں گے۔ گویا ان ممالک میں اور ان لوگوں میں ربِ جلیل نے دینی کام کا دروازہ کھول کر ہمیں عید کی مسرتیں عطا کر دیں۔ دوسرے روز احباب کا بہت بڑا اجتماع تھا، جس کے بیان کا خلاصہ ہی عرض کیا جا سکتا ہے اور وہ یوں کہ ربِّ جلیل نے ساری تخلیق میں انسان کو نہ صرف اشرف قرار دیا بلکہ عجیب و غریب صلاحیتوں سے نواز کر اپنے حسنِ تخلیق کا نمونہ بنا دیا، اور اس کی بنیاد ہی عجیب رکھی کہ جوڑ کے لیے نسبت شرط ہے۔ بھلا دو ضدوں میں کبھی جوڑ لگا کرتا ہے؟ مگر اللہ چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ اس نے عالمِ امر کی ایک لطیف تجلی کو عالمِ مادی کے کثیف ترین حصے، ذرّاتِ خاکی سے پیوند کر دیا اور پیوند بھی ایسا کہ روح کے جوڑنے مشت خاک کو بھی حیاتِ جاوداں سے آشنا کر دیا۔ اللہ کریم قیامِ قیامت، نظامِ کائنات کو تباہ کر دے گا، مگر وجود کے ذرّاتِ

خاکی پھر سے جمع ہو کر مجسم انسان بن جائیں گے اور پھر کبھی موت کی پر اسرار گہرائی میں نہ اتریں گے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کس حال میں رہیں گے۔

روح کیا ہے؟ اور کہاں سے آتی ہے؟ کہاں جاتی ہے؟ اور اس کا انجام کیا ہے؟ یہ ہے وہ سوالات جن کا جواب ہمیشہ انبیاؑ علیہم السلام نے ہی دیا، کوئی فلسفی یا مفکر نہ دے سکا۔ بلکہ فلاسفر سفرِ حیات کو پیدائش سے موت تک ہی جانتے ہیں، اس کے باہر ان کی کم نگاہی نے انہیں سوائے اندھیروں کے کچھ نہ دیا۔ چنانچہ جب اہل مکہ، علمائے یہود کے پاس مدینہ اس غرض سے آئے کہ ہم اس مدعی نبوت کو کیسے لاجواب کر سکتے ہیں؟ تو انہوں نے جو مختلف سوال بتائے، ان میں سب سے معرکے کا سوال روح کے متعلق ہی تھا کہ یہ وہ علم ہے جو عقل سے نہیں، دل کی راہ سے آتا ہے۔ اور کسی کتاب سے نہیں، ذات باری سے ملتا ہے اور نبیؐ کے علاوہ کوئی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ تو اسی کے جواب میں ارشاد ہوا کہ روح اللہ کے امر سے ہے، اور اس سے زیادہ سمجھنے کی تم صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ محققین کے مطابق جس طرح جسمِ مادی میں اعضائے رئیسہ رکھے، اور دماغ و عقل کو ان کا حاکم بنایا، نیز عقل کو یہ استعداد بخشی کہ وہ اساتذہ سے علوم حاصل کرے تاکہ بدن کی ضروریات کو بہتر طور پر جان کر ان کی تکمیل کے بہترین سامان کرے۔ اور ان نعمتوں سے کائنات کو بھر دیا جن سے انسان چن چن کر اپنے بدن کی بقاء اور آرام و صحت کا اہتمام کرتا ہے۔ اسی لیے علوم دُنیا کا حصول ایمان سے مشروط نہیں۔ کافر بھی سب کمال حاصل کر سکتا ہے، شرط صرف اساتذہ کی خدمت میں رہ کر تعلیم کا حصول ہے۔ مگر روح کا مرکز قلب یعنی اس گوشت کے لوتھڑے کے اندر ایک لطیف شے رکھ کر اسے بنایا، اور جس طرح مٹی کے ساتھ مختلف چیزوں کو ملایا، ایسے ہی قلب کے ساتھ مختلف لطائف بنائے۔ یعنی روح لطیف تھی، اس کی غذا بھی لطیف، اس کی دوا بھی لطیف، تو اس کے حصول کے لیے لطائف کو سولر سسٹم کی طرح جسم انسانی میں فٹ کر دیا۔ مادی نظام کی ہر طرح کی حیات کا بنیادی سبب اور نظام عالم کی انرجی سورج کو بنا دیا، اسی طرح عالم روحانی میں حضرت محمد

رسول اللہ ﷺ کو سراجِ منیر یعنی روشنیاں لٹانے والا چراغ بنا دیا۔ آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان تمام انبیاء کے ایمان کا حصہ تھا، اور تمام پہلی امتوں نے بھی آپ ﷺ کی نبوت کو قبول کر کے نور اور روشنی حاصل کی، مگر اپنے انبیاء کی وساطت سے، کہ سب عالموں کے لیے رحمت آپ ﷺ ہی کی ذات تھی، ہے، اور رہے گی۔ یہ اس امت کی فضیلت ہے کہ اس نے آپ ﷺ سے براہِ راست روشنی پائی۔ لہٰذا ان کا سولر سسٹم براہِ راست شمس نبوت کے سامنے تھا جس نے ان کی روحانیت کو اس درجہ بلندی پر پہنچایا کہ نوع انسانی کی فلاح اور دعوت اِلی اللہ کا منصب انہی کو نصیب ہو گیا۔ آپ ﷺ پر نبوت تمام ہوئی اور نئی نبوت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب لطائف یا سولر سسٹم انرجی پاتا ہے تو عقل کو بھی جلا ملتی ہے، اور وہ غیر مسلم اور کافر کی عقل کی نسبت امورِ دُنیا بھی بہت بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ اس کی دلیل واضح ہے کہ آپ ﷺ جہاں مبعوث ہوئے، وہ معاشرہ ذلت کی اس گہرائی تک گر گیا تھا کہ شاید اس سے آگے کا تصور ممکن نہ ہو۔ اور تاریخ میں اس کی نسبت ظالمانہ دور نہ پہلے گزرا اور نہ بعد میں آیا، لیکن جسے نورِ ایمان نصیب ہوا اور ایک ملاقات آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہوئی، وہ بالکل دوسرا آدمی ہو گیا۔ رنگ قد اور نقش تو وہی رہے، مگر اندر سے انسان بدل گیا، اور پورا ایک سو اسی (180) درجے بدل گیا، یعنی ڈاکو تھا اگر، تو غریب پرور اور سخی ہو گیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اس کے ساتھ امورِ دُنیا میں بھی وہ اقوام عالم کو مات دے گئے۔ سیاسیات، اخلاقیات، امورِ انتظامی ہوں یا میدانِ جنگ، کاروبار و تجارت ہو یا سفارت، انہوں نے ربع صدی میں تین حصے معلوم دُنیا فتح کر کے تاریخ انسانی میں ایک ایسی سلطنت بنا دی جو چین سے ہسپانیہ تک اور سائبیریا سے افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک اَن پڑھ معاشرے کے خانہ بدوش ایسے نامی جرنیل اور فاتح بنے کہ تاریخ ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ آخر

انہوں نے کہاں سے پڑھا؟ صرف آپ ﷺ کی توجہ اور فیضِ صحبت سے ان کے لطائف یا سولرسسٹم ایسا منور ہوا کہ عقلِ ظاہر کو بھی منور کر گیا۔ دُنیا میں ان سے پہلے تمام نظامِ حکومت کا ڈھانچہ کچھ ایسا ہوتا تھا کہ بادشاہ مختلف علاقوں پہ حاکم مقرر کر دیتا جو سے سالانہ ٹیکس دیتا، اور بادشاہ کی خاطر فوج رکھتا مگر اپنے علاقے میں خودمختار ہوتا، اور بس! عہدِ فاروقی میں ایک طرزِ حکومت بنایا گیا کہ زمین کی پیمائش کی جائے۔ تحصیل، ضلع اور صوبہ بنایا جائے۔ حکومت کو لوگوں کی آمدن کا علم ہو اور ان سے جائز ٹیکس لیا جائے۔ نیز ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے۔ فوج چھاؤنیوں میں رہے اور صرف میدانِ کارزار سے واسطہ رکھے۔ پولیس فورس بنائی جائے جو امورِ انتظامی کی نگہداشت کرے۔ مگر قانونی ادارے الگ ہوں جو انصاف کریں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگوں نے بہت نام بدلے، بادشاہت، سیکولر سٹیٹ، سوشلزم اور جمہوریت وغیرہ مگر حکومت کا بنیادی ڈھانچہ ابھی تک وہی ہے جو صحابہ کرامؓ نے دیا تھا کہ وہ بہترین طرزِ حکومت تھا، اور ہے۔ تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب یہ سسٹم روشن ہوتا ہے یا لطائف منور ہوتے ہیں تو نیکی کی نہ صرف رغبت دلاتے ہیں بلکہ اس کا فلسفہ بھی پلے پڑتا ہے، اور برائی کی بھدی صورت بھی سامنے آ جاتی ہے۔ دینی علم میں بھی لذت انہی سے نصیب ہوتی ہے ورنہ علم محض فلسفہ لگتا ہے اور عمل نرا بوجھ۔ آپ ﷺ کی صحبت سے صحابہؓ نے فیض پایا، تو ان کی مجالس میں تابعی بنے اور پھر تبع تابعین اسی اصول پر بنے۔ پھر اللہ کے خاص بندوں نے عمریں صرف کر کے یہ نورِ قلب حاصل کیا۔ مشائخ کو پانے کے لیے ایک عالم میں پھرے، ان کی صحبت میں دل روشن کیے اور آگے یہ نور پھیلاتے چلے گئے۔ اسی لیے ہر انقلاب کی بنیاد ایسے ہی صاحبِ حال اور صاحبِ دل لوگ بنے۔ آج اگر روئے زمین پر، اور اقوامِ عالم میں مسلمان قوم نوکِ سناں پہ گزارہ کر رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے اس نورِ قلب کا نہ صرف حصول چھوڑ دیا بلکہ اس کی اہمیت ہی سرے سے بھلا دی، تو عبادات اور معاملات سے روح فنا ہو گئی۔ نہ نماز میں سکون، نہ حج سے اصلاح، اور نہ ہی وعظ سے توبہ

نصیب ہوئی۔آج بھی ضرورت ہے کہ دلوں کا نور حاصل کیا جائے۔ایسی مجالس اور ایسے لوگ تلاش کیے جائیں اور پھر سے اس امت کو سربلندی کی منزل کی طرف موڑا جائے۔

ہم نے 21 سے 26 تک دو بار لندن، ایک بار برمنگھم اور ایک بار مانچسٹر کے علاوہ متعدد اجتماع بریڈفورڈ میں کیے۔ الحمدللہ! اب تعداد گھروں سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ احباب نے دارالعرفان، بریڈفورڈ بنانے کا فیصلہ کیا اور یوں یہ سفر تمام ہوا۔ آخری اجتماع مانچسٹر میں تھا جس سے 27 جون، شام 8 بجے فارغ ہو کر ایئرپورٹ چلے گئے اور جہاز ہمیں کوپن ہیگن، ماسکو، تاشقند، سمرقند، کابل کے اوپر سے گزارتا ہوا 29 جون کی صبح کو اسلام آباد لے آیا۔ الحمدللہ! کہ سفر تمام ہوا، کسی نئے سفر کے آغاز کے لیے، اور اب چند اشعار کہے جو ایک عزیزہ کے خیال پر کہے گئے۔ اگرچہ شعری اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے مگر جذب دروں کی عکاسی کر ہی گئے۔ والسلام۔

فقیر محمد اکرم اعوان

دارالعرفان، منارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

20 دسمبر 1991ء بریڈفورڈ، برطانیہ:

امسال شروع سال کا حرمین شریفین کا سفر نصیب نہ ہوا، اور ویزے لگنے کے بعد خلیج کی جنگ کے باعث پروازیں ہی بند ہو گئیں۔ پھر رمضان المبارک کے بعد برطانیہ اور پھر امریکہ چلے گئے، اور یوں سال کے درمیان کے چند ماہ مغرب کے سفر کی نذر ہوئے، جن کا مختصر تذکرہ کر چکا ہوں۔ واپسی پر صحت کسی حد تک بگڑ سی گئی اور ایک آدھ بار راولپنڈی جانا ہوا اور دو بار لاہور، مگر کوئی قابل ذکر سفر نہ ہو سکا۔ یہ سہولت میسر رہی کہ جو احباب دارالعرفان تشریف لاتے، ان سے ملاقات رہتی مگر سفر حرم کی حسرت باقی تھی۔ چنانچہ عمرہ کا پروگرام بنا اور اکتوبر کے آخر میں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ غالباً 24-اکتوبر کو

کراچی ٹھہر کر 25 کو ہم جدہ اور پھر حرم شریف پہنچ گئے۔ 30 کے لگ بھگ احباب تو پاکستان سے ہمراہ تھے۔ سعودیہ میں مقیم ساتھی بھی جمع ہو گئے اور یوں بارگاہ الٰہی میں ایک چھوٹا سا جہان الگ بسا لیا۔ اللہ کریم کا احسان کہ صحت ایسی بحال ہوئی کہ مدتوں بعد اس بار پھر غارِ ثور تک چڑھنے اور زیارت و ذکر کی سعادت نصیب ہوئی۔ 30 اکتوبر کو ہمیں بارگاہِ رسالت ﷺ میں مدینہ منورہ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور حرمِ نبوی میں آٹھ روز گزارے۔ وہاں بھی ایک روز بدر کی زیارت کے لیے جانا نصیب ہوا۔ الحمدللہ! پروگرام یہ تھا کہ بچوں کو جدہ سے واپس بھیج کر ابوظہبی چلا جاؤں گا اور ہفتہ ڈیڑھ ٹھہر کر واپس پاکستان جاؤں گا۔ دو ساتھیوں کو بھی ساتھ جانا تھا، مگر عجیب تماشا ہوا کہ سامان تو جدہ پڑا ہوا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، بچوں کو تیار کر کے دیگر احباب کے ہمراہ ایئر پورٹ گئے۔ پہلے ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا کہ انہیں روانہ کر دیتے اور خود دوسری پرواز سے، یا دوسرے روز جہاں جانا ہوتا چلے جاتے۔ ایک بار نیروبی جانا تھا، اور کئی بار عرب امارات گئے، مگر اس بار جب وہ چیک اِن ہونے لگے تو امیگریشن والوں نے کہا کہ آپ بھی ساتھ جائیں گے، اور یا یہ بھی نہیں جائیں گے۔ کمال ہے بھئی! ان کا تو سارا سامان جہاز میں چلا گیا اور اپنا سارا سامان اقامت گاہ پر پڑا ہے، تو یہ کیسے ہوگا؟ ان سے بات ہوئی تو وہ کہنے لگے آپ PIA کے مسافر ہیں، ان سے بات کریں۔ ان سے بات ہوئی تو وہ خود کو بے بس ظاہر کرتے تھے۔ ناچار یہ کہا کہ پھر ہمیں بھی بک کرو، چنانچہ انہوں نے ہمیں بھی بک کر دیا اور سامان جدہ میں چھوڑ کر ہم علی الصبح اسلام آباد جا پہنچے اور یوں 9-نومبر کو ہم اسلام آباد تھے۔ اب پھر سے عرب امارات کا ویزا منگوانا پڑا۔ نئے ٹکٹ بنے اور ایک بار پھر 18-نومبر کو ہم کراچی تھے۔ بچے تو گھر رہ گئے اور کرنل صاحب اور میں 19-نومبر کو کراچی سے ابوظہبی چلے گئے۔ ہفتہ بھر وہاں قیام رہا۔ العین گئے اور پھر 27-نومبر کو دوبئی سے اسلام آباد واپسی ہوئی مگر ساتھ ہی یہ پروگرام بھی کہ دسمبر میں برطانیہ جانا ہوگا۔

22-دسمبر 1991ء:

برطانیہ سے جو ساتھی عمرہ کے لیے گئے تھے، ان کا خیال تھا کہ دسمبر کا آخری ہفتہ چھٹیوں کا ہفتہ ہوتا ہے لہٰذا بہت سے لوگوں سے ملاقات کی جاسکتی ہے اور دینی اجتماع بہت اچھے ہوسکتے ہیں۔ میں نے بھی حامی تو بھر لی مگر پھر برطانیہ کے موسم اور سردی و برف باری سے خیال آتا کہ کام کرنا اتنا آسان بھی نہ ہوگا لہٰذا پھر کبھی سہی۔ اس ادھیڑ بن میں وقت گزر گیا اور 19-دسمبر کو گھر سے پنڈی کے لیے نکلا۔ ڈاکٹر بٹر ساتھ تھے، وہ امریکہ جارہے تھے تو پروگرام بنا کہ اکٹھے چلتے ہیں۔ برطانیہ مل کر ٹھہریں گے، پھر میں وہاں سے واپس آجاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب نیویارک چلے جائیں گے۔ مگر ایک خیال یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو روانہ کر کے پنڈی سے واپس آجاؤں گا۔ 19 کو چلتے وقت ڈاکٹر عبدالرشید صاحب سے بات ہوئی تو کہنے لگے ''حضرت ضرور جائیں، وہاں سردیوں میں سردی نہیں ہوتی۔ اگرچہ باہر برف پڑی ہو مگر گھر، دفتر اور مساجد تک میں ہیٹر چلاتے ہیں اور سب جگہیں گرم ہوتی ہیں۔ ہاں! گرمیوں میں ہیٹر بند کر دیتے ہیں اور وہ لوگ تو عادی ہیں مگر ہمیں تب بھی سردی لگتی ہے''۔ بس! اس بات نے فیصلہ پر پہنچا دیا کہ چلتے ہیں۔ رات راولپنڈی میں گزاری۔ بہت سے احباب سے ملاقات رہی، ذکر ہوا اور یوں صبح ہم برٹش ایئرویز سے عازمِ برطانیہ ہوئے۔ ہمارے ایک عزیز نوید صاحب برٹش ایئرویز میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے ہماری سیٹیں بزنس کلاس میں بنوادیں۔ یہ کوئی بیس پچیس کے لگ بھگ سیٹیں دوسری منزل پر ہوتی ہیں اور بہت کھلی اور آرام دہ بھی ہوتی ہیں۔ پھر لوگ بھی کم ہوتے ہیں اور سلجھے ہوئے افراد بیٹھتے ہیں۔ جہاز کے سفر میں یہ جگہ بہت پرسکون اور آرام دہ ہوتی ہے۔ سروس بھی اچھی ملتی ہے کہ لوگ کم ہوتے ہیں تو انہیں سروس کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ کھانا اسلام آباد سے لیتے ہیں، لہٰذا یہ بتا دیا جاتا ہے کہ سب حلال ہے مگر محض اعتبار ہی کرنا پڑتا ہے، ورنہ اب بڑے ہوٹلوں اور کمپنیوں میں تو مسلمان بھی حلال کی کم ہی پروا کرتے ہیں۔

صبح نو بجے کی پرواز تھی جو پاکستانی وقت کے مطابق چھ بجے شام اور برطانیہ کے وقت کے مطابق ایک بجے دِن مانچسٹر پہنچی، یعنی نو گھنٹے راہ میں گزرے اور یہاں دوپہر تھی۔ دِن بہت ہی لمبا ہوگیا، سامان وغیرہ کے لینے میں کوئی دو گھنٹے ایئرپورٹ پر لگے، اور یہاں تو پانچ بجے شام ہوجاتی ہے۔ برطانیہ میں آج کل دِن کوئی ساڑھے چھ گھنٹے کا اور رات ساڑھے سترہ گھنٹے کی ہے، مگر کیا مجال جو کسی کام میں خلل آئے۔ دفاتر اور فیکٹریاں طلوعِ آفتاب سے قبل کھل جاتی ہیں اور رات گئے اپنے کام کا وقت پورا کرکے بند ہوتی ہیں، جبکہ ہمارے ہاں تو شاید چھٹی رہتی۔ یہاں اس پر ایک مصیبت بارش، طوفان اور برف باری کی بھی ہے، مگر یہ لوگ کام کرتے ہیں۔

ہم نے مانچسٹر دوپہر کا کھانا کھایا، اگرچہ جہاز میں بھی دوبار کھانا دیا گیا تھا۔ دوبار اس لیے کہ پہلے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا ہے، اور اس کھانے کے ساتھ سب لوگ صرف کھاتے ہی نہیں پیتے بھی ہیں، اور ڈٹ کر پیتے ہیں کہ شراب اور انگریز کو ملے، پھر مفت میں ملے تو اسے کون روکے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر ڈٹ کر سوجاتے ہیں۔ بس! جس کسی کی آنکھ کھلے اور باتھ روم تک بہ مشکل جاتا ہے، وہ بھی صرف ایک آنکھ کھول کر کہ دونوں کھولنے سے نیند بے مزہ نہ ہوجائے، اور جانا مجبوری ہوتی ہے کہ شراب زیادہ پیٹ میں رکتی نہیں، اور واپس آکر سوجاتا ہے۔ یوں پانچ چھ گھنٹے بڑے آرام سے گزرتے ہیں، بلکہ جہاز میں مووی چلتی رہتی ہے اور ایک کے بعد دوسری لگائی جاتی ہے۔ انہوں نے غالباً چھ گھنٹے تو لیے ہوں گے مگر سب لوگ نیند کے مزے لیتے رہے، اور کمال یہ ہے کہ برطانوی جہاز کی مووی تھی اور اس میں کسی قسم کی بے حیائی کی نمائش نہ تھی۔ خیر میں نے کھانا بھی کھایا اور ظہر وعصر بھی مانچسٹر میں ادا کی، اور چل دیئے۔ بریڈفورڈ تک راستہ تو صرف گھنٹے بھر کا ہے، مگر مغرب راہ میں ہی ہوگئی جو ہم نے گھر پہنچ کر ادا کی، اور عشاء کے بعد کھانا کھایا۔ ذکر کی مجلس ہوئی اور یوں رات کے دس بج گئے جو پاکستانی وقت کے مطابق اگلے روز کی صبح کے تین بجے تھے، یعنی ہمیں جاگے ہوئے پورے 24- گھنٹے گزر

چکے تھے، لہٰذا سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دو بج رہے تھے اور یہاں ساڑھے آٹھ سورج طلوع ہوتا ہے۔ چھ بجے ذکر کا وقت تھا، پھر لیٹے، بھلا نیند کہاں، چار گھنٹے تو سو لیا تھا، سوچا نہا لیں۔ نہا دھو کر پھر بستر میں گھسے اور کچھ جاگ کر اور کچھ سو کر وقت بسر کیا۔ اس طرح ہمارا پہلا دِن بھی بہت لمبا تھا، اور پہلی رات بھی شب ہجراں سے دراز۔

برطانیہ کے موسموں کا تو ویسے بھی اعتبار نہیں، اور پھر سردیوں میں بارش یا برف کا طوفان، روزمرہ کی بات ہے۔ جہاز سے ہی نصف برطانیہ سفید نظر آ رہا تھا اور شمالی علاقہ برف میں لپٹا ہوا تھا۔ آج دوسرا روز ہے، مسلسل بارش اور طوفانی ہوائیں غولِ بیابانی کی طرح چنگھاڑ رہی ہیں، مگر کیا مجال جو یہاں کی زندگی کے معمولات میں فرق آیا ہو۔ عجیب قوم ہے! بات بات پہ شرط اور جوا، یہ تو ان کا مزاج بن چکا ہے۔ پاکستان میں ریفل سکیمیں حتیٰ کہ اب تو حج کے لیے بھی سودی سکیم رکھی گئی ہے، یہ سب اسی قوم سے لی گئی برائیاں ہیں۔ یہاں لوگوں نے پاؤنڈ کی شرطیں لگا رکھی ہوتی ہیں کہ کرسمس سفید ہوگا یا نہیں، اور عین 25-دسمبر کو برف پڑگئی، کرسمس سفید ہوگیا، اب ''ہاں'' والے جیت گئے تو ان کا کرسمس بڑی دھوم دھام سے ہوگا۔ ہارنے والے جیبیں خالی کر چکے، اب بینک کے ادھار پر منا لیں گے۔ اور ہاں! کرسمس پر بے شمار تحفے ایک دوسرے کو دیتے ہیں، اور لوگوں کے پاس بہت سی ایسی اشیاء جمع ہو جاتی ہیں جن کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے ہی کرسمس گزرے گا، یہ سب غیر ضروری تحفے لُوٹ سیل میں مارکیٹ میں آ جائیں گے، اور لوٹ مچے گی۔ کار بوٹ سیل بھی عجیب شے ہے۔ خاص جگہوں پر لوگ فالتو چیزیں کار کی ڈگی میں رکھ کر آ جاتے ہیں اور گاڑی کھڑی کر کے ڈگی کھول دیتے ہیں۔ اونے پونے بیچ کر چلتے بنتے ہیں۔ اب کرسمس کے بعد یہی سب ہوگا۔

23 دسمبر 1991ء:

موسم اگرچہ دو روز سے بہت شدید ہے۔ بارش کے ساتھ طوفانی ہوائیں بہت شور مچا رہی ہیں، مگر اندر کا موسم گرم ہے اور ہر کمرہ دوسرے سے زیادہ گرم لگتا ہے۔ بلکہ میں نے تو

اپنے کمرے کا ریڈی ایٹر کل سے بند رکھا ہوا ہے کہ اس کے بغیر بھی کوئی سردی نہیں۔ مگر سب طوفانوں کے باوجود احباب برمنگھم تک سے یہاں آجاتے ہیں اور ذکرِ الٰہی کی خوبصورت محفل جمتی ہے۔ پرسوں شام بھی ذکر کے بعد بیان ہوا تھا جو ذکر کی ضرورت و اہمیت ہی کے بارے میں تھا۔ مگر دو روز گزر گئے، اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ہاں! حاصل یہی تھا کہ جب تک دل کا حال تبدیل نہ ہو، اور گناہ کی تلخی کے ساتھ نیکی کی لذت کو دل ازخود محسوس نہ کرے، محض سُن کر یا پڑھ کر اس جذبے اور خلوص سے عمل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فرائض نبوت میں تزکیہ، تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے ارشاد ہوا ہے۔ اگرچہ ایمان نصیب ہونا بھی ایک حد تک قلب کے تزکیہ کا سبب ضرور ہے، مگر برکاتِ نبوت سے دل کا ذاکر ہو جانا اعلیٰ ترین تزکیہ کے حصول کا باعث بنتا ہے۔ ہماری آج یہ حالت ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم کسی بھی بات پہ متحد نہیں ہے۔ بات عقیدے سے متعلق ہو یا عمل سے، ہر بات پر جھگڑا ہے، اور مسلمان، مسلمان کا دشمن ہو رہا ہے۔ اس کا اصل سبب صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہے دلوں کی غفلت اور ذکرِ الٰہی کے نور سے محرومی کہ جب دل سے یہ دولت چھن جاتی ہے، یا اسے نصیب ہی نہیں ہو سکتی، تو اس کا حقیقی ہدف حصولِ دُنیا رہ جاتا ہے۔ اور دُنیا کے حصول پر جھگڑا ہونا ایک فطری بات ہے۔ ساری انسانی تاریخ انہی جھگڑوں اور لڑائیوں کی داستان ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت بھی سارا عالم ایک دوسرے سے دست و گریبان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو مسلمان قوم کا ظہور ہوا، اور صرف یہ ایک قوم تھی جو ہر کام قلبی خلوص کے ساتھ صرف اللہ کے لیے کرتی تھی۔ ربع صدی میں یہ پورے عالم پر چھا گئے اور تہذیب انسانی ایک خوبصورت انقلاب سے آشنا ہوئی۔ مگر آج کا حال یہ ہے کہ مسلمان ہے، مگر وہ خود بھی اسی فساد میں مبتلا ہے جس کا شکار غیر مسلم معاشرہ ہے۔ آخر کیوں؟ یقیناً دلوں کا حال وہ نہیں رہا جو ہونا چاہیے تھا۔ اور دل کی تبدیلی کے لیے ایک ہی نسخہ ہے کہ یقیناً اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ یہ ہماری بنیادی اور شدید ضرورت ہے۔ یہ تو پرسوں کی مجلس کی بات تھی۔ کل پھر احباب جمع ہوئے اور ربِّ کریم کا شکر ہے کہ احباب

بڑی محبت سے یوں جمع ہو جاتے ہیں جیسے باہر کوئی طوفان نہ ہو۔

24 دسمبر 1991ء:

بہت دیر سے نہ کچھ لکھ سکا اور اب جو پرسوں بیان ہوا تھا، اس کا خاکہ ہی ذہن میں ہے۔ وہ اس آیت کریمہ کے مطابق تھا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ آج ہم بحیثیت امت اور قوم کے انتشار اور تفریق کے عمل سے بہت بری طرح متاثر ہیں، حالانکہ صریح حکم موجود ہے وَلَا تَفَرَّقُوْا کہ آپس میں کبھی تفریق کا شکار نہ ہونا۔ فقہی مسائل میں اختلاف تو ایک فطری بات تھی، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی تھا اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رحمت قرار دیا تھا۔ وہ اختلاف سمجھ اور ادراک کا تھا، اور ایک عمل کے کرنے یا اس کی اصل میں نہ تھا۔ طریقۂ عمل میں بھی صرف اس قدر تھا کہ اپنے طریقے کو دوسرے سے بہتر خیال کرتے تھے، اگرچہ دوسرے کو بھی غلط نہیں کہا جاتا تھا۔ مثلاً تکبیر پر ہاتھ اٹھانے کی بات ہے تو اصولاً اس پر سب متفق تھے کہ تکبیر پر ہاتھ کانوں تک اٹھائے جائیں۔ اب ایک طبقہ ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھاتا، اور دوسرا صرف پہلی تکبیر پر، لیکن دونوں ایک دوسرے کو باطل نہیں کہتے تھے بلکہ اپنا طریقۂ عمل دوسرے سے بہتر خیال کرتے تھے۔ مگر اب یہی عمل ہمیں کفر و اسلام تک لے گیا ہے اور اتنی سی بات پر ایک دوسرے پر فتوے لگتے ہیں۔ یہ حال، ہر ہر عمل اور اب تو عقیدے میں بھی ہے۔ امت کی اس تفریق نے اجتماعی قوت ختم کر کے ہمیں غیر مسلم طاقتوں کی غلامی میں دے دیا اور ہمیں ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب تو ہر لیڈر، وہ پیر ہو یا مولوی، اپنے ساتھ ہم خیال لوگوں کا گروہ رکھتا ہے جو اپنے علاوہ کسی کو مسلمان ماننے پر تیار نہیں ہوتے، اور یہ تقسیم بڑھ رہی ہے۔ مساجد میں لڑائی اور ایک دوسرے پر فتوے روز کا معمول بن چکے ہیں، تو کیا اس سارے ہنگامے سے نکلنے کا بھی سوچا جائے گا، یا ہم مزید اسی دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے؟ ہم اس کا حل تلاش کریں تو وہ صرف ایک نظر آتا ہے کہ سب لوگ کم از کم اپنے اللہ کو تو خلوص سے یاد کریں اور اللہ کا ذکر کیا کریں۔ کسی طریقے سے کریں، کسی انداز سے کریں، مگر کم از کم اُن کے چوبیس گھنٹے میں چوبیس منٹ ہی سہی،

ذکرِ الٰہی بھی تو ہو۔ اللہ کا ذکر دلوں کو راحت، روشنی اور شعور عطا کرتا ہے اور دل میں برائی سے نفرت اور نیکی کی محبت پیدا کرتا ہے۔ تو اس طرح اللہ کرے کہ ہم پھر سے اتحاد و اتفاق کی برکات حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کوئی ہمارے ساتھ ہی ذکر کرے، یا ہمارے طریقے سے ہی کرے، مگر یہ ضروری ہے کہ ذکر تو کرے۔ اگر وہ ہم سے استفادہ چاہے تو ہم حاضر ہیں، ورنہ کہیں سے کرے۔ اللہ کرے کہ سب مسلمان اس ایک بات پر متفق ہو سکیں۔

پھر کل ہم مانچسٹر گئے۔ پچھلے پہر جانا تھا اور کئی روز بعد کل پچھلے پہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مطلع شفاف اور ہوا پر سکون۔ سردیوں میں لوگ مغرب میں بھی کپڑے پہننے لگتے ہیں اور یوں ماحول کسی قدر بہتر نظر آنے لگتا ہے، ورنہ گرمیوں میں تو یہ لوگ کھال ہی میں گزارہ کرنے کے قائل ہیں۔ لہٰذا آج کل باہر جانے میں پہلے کی طرح بے حیائی کم نظر آتی ہے۔ بالکل ختم تو نہیں ہو سکتی، ہاں! گھٹ جاتی ہے اور پس دیوار چلی جاتی ہے۔

مانچسٹر میں کافی خواتین بھی ذکر کرتی ہیں۔ پہلے ان کا اجتماع اور ذکر ہوا، پھر دوسری جگہ احباب بھی جمع تھے، وہاں بیان اور ذکر ہوا، اور کل کا بیان ''معیت رسالت'' پر تھا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ ہر کلمہ گو کو قبولِ ایمان کے ساتھ معیت رسالت نصیب ہوتی ہے، جس کی صورت کتاب اللہ میں ارشاد ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کفر اور اللہ کی نافرمانی کے لیے سخت ہو جاتا ہے، اور ایمان و اطاعت کے لیے اس کا دل محبت سے بھر جاتا ہے۔ زندگی کے سارے کاموں کو اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کا ہر لمحہ اور ہر کام اللہ کی عبادت اور رکوع و سجود بن جاتا ہے، اور دُنیا و آخرت کی تمام نعمتیں اور راحتیں صرف اللہ سے طلب کرتا ہے یعنی اسے خریدا نہیں جا سکتا، نہ ہی رعب سے اور خوفزدہ کر کے اس سے کوئی کام لیا جا سکتا ہے۔ اور جب اسے یہ منزل نصیب ہوتی ہے تو انوارات الٰہی اس کے چہرے پر رقصاں معلوم ہوتے ہیں، اور یہی کمالِ معیت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے ہی یہ عظمت نصیب ہوئی۔ تو یہاں یہ بخوبی پرکھا جا سکتا ہے

کہ ہماری معیت یا ہمارا ایمان کس قدر مضبوط ہے، اور اس پر کتنا نتیجہ حاصل ہو رہا ہے۔ اگر واقعی نافرمانی سے نفرت اور نیکی سے محبت ہونے لگے تو یہی مقصد ہے۔ اللہ کرے! اس میں ترقی ہوتی رہے اور درجہ کمال نصیب ہو، اور اگر ایسا نہیں ہو رہا تو پھر ہمارا تعلق بہت کمزور ہے، اسے مضبوط کرنا ہی فرضِ اولین ہے۔ ربِّ جلیل ہم سب کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

... آمین ...

25 دسمبر 1991ء:

رات بھی احباب بہت جمع تھے اور بفضل اللہ ذکر میں تیس صفیں تھیں، کچھ دوست نئے بھی تھے۔ رات یہاں کرسمس کی شام بھی تھی۔ یہ لوگ بھی ہمارے شیعہ دوستوں کی طرح کی شامِ غریباں کے ہی قائل نظر آتے ہیں۔ گرجوں میں جاتے اور گاتے بجاتے بھی ہیں، مذہب بھی الف لیلوی سا بن گیا ہے۔ چنانچہ عقل سے دور، محض قصے کہانیاں بیان کرتے اور سنتے ہیں، اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوشی میں جی بھر کر شراب پیتے، بلکہ ایک دوسرے پر انڈیلتے ہیں اور جن سے جتنا بن پڑتا ہے اس حد تک بے حیائی اور برائی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کیا نرالی بات ہے! کہ ولادت تو نبیؑ کی منائی جائے، اور ارتکاب گناہوں کا کیا جائے۔ اب یہ مصیبت مسلمانوں میں بھی رچ بس رہی ہے کہ جشنِ میلاد کے نام پر چندے چھینے جائیں۔ ہاں! کبھی چندے مانگے جاتے تھے، اب چھینے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کی ٹولیاں سڑکوں پر چادریں پھیلا کر چل پڑتی ہیں، اور کس کی مجال ہے جو اس میں روپے نہ پھینکے، کھڑے کھڑے بے عزتی کر دیتے ہیں۔ پھر خوب گانا بجانا، کھانا پینا اور رقص کے ساتھ جلوس، روشنیاں اور چراغاں۔ نہ اطاعت کی فکر، نہ سنت کی پروا۔ اللہ ہی ہے جو ہدایت دے۔ بہر حال وہ اپنے کام میں لگے رہے اور ہم اپنا کام کرتے رہے، خوب جی بھر کر ذکر کرتے رہے اور بیان بھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ آخرت میں اگر ثواب ملتا ہے تو وہ دُنیا سے الگ نہیں رہتا، بلکہ ایسی حالت میں دُنیاوی کردار سدھر جاتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ یعنی اگر نماز درست اور مقبول ہو تو دُنیاوی اعمال کی اصلاح

ہوجاتی ہے، یہ اُخروی ثواب کا اثر ہے۔لہٰذا ہمیں ذکر اذکار اور نوافل وتسبیحات سے صرف آخرت ہی کی امید نہیں رکھنی چاہیے، بلکہ دُنیا میں اپنے عمل پہ نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ اگر ہماری عبادات مقبول ہوں گی تو یقیناً دُنیا میں ہمارا کردار سدھر جائے گا، آخرت کی بنیاد ہی عقیدہ اور عمل ہے، اور بغیر عمل کے آخرت کی تعمیر بھی نہیں ہوتی۔اسلام عملی مذہب ہے اور دُنیا کے ہر کام میں ایک معیاری اور بہت خوبصورت انداز عطا فرماتا ہے، اور عبادات اس پرعمل کرنے کی توفیق کا باعث بنتی ہیں۔اس موضوع پر گھنٹہ بھر کی بات تھی جو سب تو نقل کرنا مشکل ہے، ہاں! حاصل گفتگو یہی تھا، جو عرض کر دیا۔

احباب فون کے ذریعہ سے رابطہ رکھتے ہیں۔امریکہ بات ہوئی، دوبئی سے فون آیا اور جاپان سے ساتھی وقت مانگ رہے تھے۔ اللہ کرے! یہاں سے بخیر وخوبی واپس پہنچیں تو ان شاء اللہ مشرق کو روانہ ہوں گے، اور بنگال، فلپائن اور جاپان ہوتے ہوئے امریکہ تک جائیں گے۔یہ سب اللہ کریم کی ارزاں کردہ توفیق ہے، ورنہ بندہ تو اپنی ذات میں بے حد محتاج ہے، چہ جائیکہ دوسروں کو سنبھلنے کا موقع دینے کا باعث بن سکے۔

یکم جنوری،1992ء:

آج سن عیسوی کا نیا سال شروع ہوا ہے اور ہم عیسائیوں کے ملک میں ان کی منائی جانے والی رسومات کو دیکھ اور سن رہے ہیں۔سب سے بڑی بات یہ کہ ربِّ جلیل کا احسان ہے کہ اب اس ملک میں بھی مسلمانوں میں ایک حد تک بیداری پیدا ہو رہی ہے کہ انہیں بجائے ان کی نقالی کرنے کے، اپنی ذات اور اپنے وجود کا احساس ہو رہا ہے۔اور یہ سب اللہ کریم کے ذکر اور اس کی یاد، اور سلسلہء عالیہ کی برکات کا اثر ہے ورنہ تو دینی جماعتیں بحمد للہ! عرصہ دراز سے مصروف عمل ہیں، اور بہت سے لوگ جماعت اسلامی کی محنت سے، اسی طرح تبلیغی جماعت کی کوشش سے، کچھ علماء اور مشائخ حضرات کے سبب، بہر حال اسلام پر عمل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔مگر جو خوبصورت اور مثبت تبدیلی برکاتِ سلسلہ کے سبب سے ہے، وہ سب سے الگ ہے۔اور احباب میں نہ صرف اسلام پر پوری شدت

اور پورے خلوص سے عمل پیرا ہونے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگنے کی تڑپ بیدار ہو رہی ہے۔ اور اب تو الحمد للہ! سلسلہ میں بہت لوگ شامل ہو کر ذکرِ الٰہی کی برکات سمیٹ رہے ہیں۔

اس بار ہم نے کہیں آنے جانے کا پروگرام نہ رکھا اور بریڈفورڈ مرکز میں ہم جم کر کام کرتے رہے۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب اور منیر گلاسگو گئے، اور ایک روز ہم سب مانچسٹر گئے کہ وہاں بھی بہت سے احباب اور ان کے اہل و اعیال ذاکر ہیں، مگر ان دِنوں میں بھی مرکز میں ذکر بدستور ہوتا رہا، اور الحمد للہ! اس کا بہت فائدہ ہوا۔ اب تو لوگ مرکز میں نہیں سما سکتے۔ ان شاء اللہ اور کوئی بڑی جگہ بنانا پڑے گی۔

اب 2- جنوری کو پروگرام ختم ہو رہا ہے، ان شاء اللہ اسلام آباد واپسی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں سے امریکہ چلے جائیں گے، اور میں دو ہفتہ پاکستان بسر کر کے بنگال، فلپائن اور جاپان ان شاء اللہ۔ لہٰذا پھر ان ایام میں ملاقات ہوگی۔

❂✿❂✿❂✿❂✿❂

19 جنوری 1992ء:

پھر سے بیگ اٹھایا اور ہم راہ نوردِ شرق ہوئے۔ غَرب سے لوٹے تھے، شَرق کو چل دیئے۔ رات کو راولپنڈی میں احباب کا اجتماع تھا۔ دوسرے روز کراچی کے لیے جہاز میں بیٹھا اور 12- بجے دوپہر پہنچ گیا۔ مصروفیت نے رات 12- بجا دیئے۔ صبح 4- بجے ایئر پورٹ کو نکلے۔ کرنل محبوب صاحب نے تھائی لینڈ تک رفاقت کا ارادہ کر لیا تھا، سو وہ بھی ہمراہ ہو لیے اور یوں 6- کے بجائے 7- بجے صبح کراچی سے اُڑ کر ہم کوئی سوا گیارہ بجے دِن ڈھاکہ پہنچ گئے۔ دو سال پہلے جب میں بنگلہ دیش آیا تھا، جہاز کراچی سے کھٹمنڈو اور پھر ڈھاکہ آیا تھا۔ کھٹمنڈو کے ٹو (K-2) کی مشہور چوٹی کے دامن میں ہے اور بہت خوبصورت نظارہ تھا مگر تب کیمرہ ساتھ نہ تھا۔ اب کے خاص اہتمام اور خیال سے کیمرہ ساتھ رکھا تو جہاز میاں سیدھے ڈھاکہ پہنچ گئے۔ یہ 21 جنوری کا دِن تھا، احباب ہوائی اڈے پہ منتظر

تھے۔قیام گاہ کو روانہ ہوئے تو ڈھاکہ کو پہلے کی نسبت کافی بدلا ہوا پایا۔سب سے پہلی نگاہ گاڑیوں پر پڑی جو پہلے یہاں بہت کم اور صرف پرانی نظر آتی تھیں۔اب یہ نئی کاروں سے بدل گئی تھیں اور تقریباً ہر قسم کی گاڑی دیکھی، حتیٰ کہ پجیرو اور لینڈ کروزر کے نئے ماڈل بھی سڑک پر تھے۔دوسری چیز یہ دیکھی کہ سڑکیں بہت کھلی کر دی گئی تھیں، بلکہ ایئر پورٹ سے آنے والی سڑک جب شہر کو مڑتی ہے تو اتنی چوڑی ہو جاتی ہے کہ بڑا ہوائی جہاز اس پر آسانی سے اتر سکتا ہے۔اگر چہ سواری کا سب سے زیادہ ذریعہ تو اب بھی وہی سائیکل رکشہ ہے، مگر اس کی جگہ اب موٹر رکشہ بھی کافی ہیں۔اور وہ موٹر رکشہ جو پیچھے زیادہ سیٹوں والا ہوتا ہے، یہاں بے بی ٹیکسی کہلاتا ہے اور وہ بھی کافی نظر آتا ہے۔نیز شہر بہت پھیل رہا ہے کہ دیہات میں زندگی دشوار ہے اور لوگ شہر کا رخ کرتے ہیں۔

مغرب کے بعد ایک ایسی ہی نئی آبادی میں بیان تھا اور وہیں قیام بھی تھا، تو ہماری موٹر کو بھی پورے شہر سے گزرنا پڑا۔بہت خوبصورت بازار بھی نظر آئے، اور دو شو روم بھی تھے جن میں نئی کاریں کھڑی تھیں۔جب نئی آبادی کو مڑے تو دیکھا کہ آبادیاں بغیر کسی منصوبہ بندی کے بڑھ رہی ہیں چنانچہ بازار اور گلیاں بہت تنگ تھیں۔یہ تو انہی ڈرائیوروں کی مہارت ہے کہ وہ راستہ بنا لیتے ہیں، اور ایک دوسرے کے پاس سے گزر جاتے ہیں، باہر کا آدمی تو پیدل بھی نہیں گزر سکتا۔آبادی بے تحاشا بڑھ رہی ہے۔لوگوں کے پاس گھر نہیں، کھانا نہیں، لباس تک نہیں مگر بچے دس دس، بارہ بارہ ہیں جو گلیوں میں بلا مقصد گھوم رہے ہیں۔اس کے ساتھ سائیکل، سائیکل رکشے، موٹر رکشے اور ریڑھی والے، پیدل چلنے والوں کا ہجوم، ایک عجیب حشر بپا ہے، اور سب سے بڑھ کر وہ سڑاند جو ان نئی آبادیوں کے نیچے کھڑے ہوئے گندے اور سیاہ پانی سے اٹھ رہی ہے۔الامان! جی ہاں! آبادی کے نیچے پانی، وہ ایسے کہ یہ لوگ گڑھے بنا کر مٹی اٹھا لیتے ہیں اور اس سے اونچا راستہ بناتے ہیں کہ برسات کے پانی سے بلند رہے جو عموماً چھ فٹ تو ضرور بلند ہوتا ہے۔اکثر اس سے دوگنا بھی، تو اس کے گرد سارا پانی ہوتا ہے جو برسات میں جمع ہو کر دوسری برسات تک کھڑا ہوا سڑتا

رہتا ہے، اور لوگ ساری گندگی اس میں پھینکتے چلے جاتے ہیں جو اس کی سڑاند میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہے۔ پھر سڑک یا راستے کے گرد بانس گاڑ کر ان پر بانس کی چھت ڈال دی جاتی ہے، جو دوکان یا مکان کا فرش بن جاتی ہے۔ پکا مکان بنانے والے کنکریٹ کے ستون بنا لیتے ہیں۔ غرض Basement یعنی تہہ خانہ سب کا پانی میں ہے اور یوں بازار سے پیچھے دور تک گھر بن جاتے ہیں، اور ہر گھر نہ صرف کوڑا کرکٹ اس پانی میں پھینکتا ہے بلکہ اپنے غسل خانے کا گٹر بھی اسی میں چھوڑ دیتا ہے۔ جیسے ہی بڑی سڑک سے مڑیں تو (اگر چہ بدبو تو بڑی سڑک پر بھی ہوتی ہے، مگر وہاں بو آرہی ہوتی ہے اور یہاں آپ بو کے اندر جا رہے ہوتے ہیں) ننگے بیمار، کمزور بچے، کچھ اچھے کپڑوں میں لوگ، کچھ گداگر اور باقی دکاندار، راستہ چلنے والوں کی ہمت کو دعوت دیتے ہیں۔ کوئی جھگڑا نہیں کرتا مگر شور بہت کرتے ہیں، اور راستہ مانگنے والا بھی شور کرتا ہے۔ راستہ دینے والا بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا ہے۔ شاید یہ شور شرابا ان کی زندگی کا حصہ ہے جسے سن کر کسی کو فکر نہیں ہوتی کہ باہر شور کیسا ہے۔ ہم بھی اسی ہجوم عاشقاں میں راستہ بناتے چلے گئے۔ ڈرائیور کافی ماہر معلوم ہوتا تھا چنانچہ بخیریت منزل پالی۔ الحمد للہ! مغرب کے بعد مسجد میں بیان ہوا۔

خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ الصّٰفّٰت کی آیات 77-75 تلاوت کیں، جس کا مفہوم ہے کہ نوح علیہ السلام نے ہم کو پکارا اور ہم کیا ہی خوب سننے اور قبول کرنے والے ہیں کہ اس کو اور اس کے ماننے والوں کو نجات دی، اور ہمیشہ کے لیے انسانیت کو اس کی اولاد سے باقی رکھا۔

بیان کا مفہوم یہ تھا:

ایمان یہ ہے کہ خواہ حالات کتنے بھی بگڑ جائیں، جہاں ظاہری اسباب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، وہاں مومن کے لیے اللہ تعالیٰ سے تعلق، اللہ کی اطاعت، اور اللہ سے دعا کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بہت لمبی اور طویل پریشانی کا مقابلہ کیا۔ ساڑھے نو سو برس قوم کو اللہ کی طرف بلاتے رہے مگر جواب میں صرف تلخ کلامی سننا پڑتی، بلکہ اکثر اوقات وہ لوگ آپ کو مارتے مارتے بے ہوش کر کے چلے جاتے مگر آپ

نے کوشش ترک نہ کی اور نہ عبادات میں کمی آنے دی۔ اللہ کے نبی اور الوالعزم رسول تھے، لہٰذا اللہ ہی سے دعا بھی کرتے رہے۔ اس طویل مدت میں تقریباً 80 مرد وزن نورِ ایمان سے مشرف ہوئے، باقی ساری قوم محروم ہی رہی تو آپ نے ان سے گلوخلاصی کی دعا کی اور کفار سے نا امیدی کی بات بارگاہ الٰہی میں پیش کی۔ عرض کیا کہ بارِالٰہا: دُنیا پہ کوئی کافر نہ چھوڑ کہ اب تو ان کی اولاد سے بھی اور آئندہ پیدا ہونے والوں سے بھی نیکی کی امید نہیں۔ کتنی نسلیں ان کے روبرو پیدا ہوئی تھیں جو ایمان سے محروم ہی نہ رہے، بلکہ برائی پھیلانے میں بھی مصروف رہے، تو اللہ کریم نے ساری مخلوق کو غرق کر دیا۔ سوائے ان افراد کے جو ان کے متبعین تھے اور ساتھ کشتی میں سوار ہوئے۔ جنہوں نے اطاعت نہ کی، ان میں آپؑ کا سگا بیٹا بھی تھا۔ آپ کی سفارش کے باوجود نہ بچ سکا کہ ارشاد ہوا یہ آپ کا کچھ نہیں لگتا، اس لیے کہ آپ کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ بد عمل ہے۔ تو وہ لوگ جن کے پاس، حکومت اور طاقت وغیرہ کے اسباب تھے، تباہ ہو گئے اور جن کے پاس اللہ کا نام تھا، وہ نہ صرف بچ گئے بلکہ قیامت تک انسانیت ان کی نسل سے یعنی نوح علیہ السلام کی نسل سے چلی۔ یہی بات جب طائف کے لوگوں کو غرق کرنے اور تباہ کرنے کا حکم لے کر فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت کا طالب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اللہ انہیں تباہ نہ فرما کہ اگر یہ نہیں تو ان کی اولادوں سے نیکی کی امید ہے، اور اللہ کریم نے عذاب ٹال دیا۔ میرے بھائی اگر کوئی خود اطاعتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کمر باندھ لے تو کس قدر رحمت سمیٹے۔ اس کا اندازہ کر لیجیے۔ دُنیا کمائیے، سیاست کیجیے، گھر بسائیے، مگر سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کیجیے اور اللہ کی عبادت کیجیے، اللہ سے دعا کرنا سیکھیے۔ دو عالم آپ کو نصیب ہوں گے ان شاء اللہ۔ اس کی بہترین مثال عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حیاتِ صحابہؓ ہے کہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سارے عالم کا کفر مخالفت پر اتر آیا اور ادھر کوئی ظاہری سبب کامیابی کا نہ تھا، مگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اطاعت نے رحمت باری کو پا لیا اور فرشتے تک میدان میں اترے۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ ممکن حد تک سب اسباب

اختیار کیے جائیں، مگر اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی حدود میں رہنا ان سب پر مقدم ہے۔ آج دیکھ لیجیے! افغان مجاہدین کے پاس سوائے اللہ کے نام کے کچھ بھی نہ تھا اور روس سے ساری دُنیا ڈرتی تھی، وہ محض کلمۃ اللہ کے لیے ڈٹ گئے تو ابھی تک پہاڑوں میں اللہ اکبر کی صدا گونج رہی ہے، اور سوویت رشیا اپنے انجام کو پہنچ کر نابود ہو چکا ہے۔ نیز مومن کی شناخت ہی اللہ کی اطاعت اور اللہ پر بھروسہ ہے، اگر وہ یہ صفات کھو بیٹھا تو گویا اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ ہم حکومت اور حکمرانوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں مگر یاد رکھو، حکمران ہمارے ہی کردار کی تصویر ہیں۔ ہم نیک ہوں تو حکمران بھی نیک نصیب ہوں گے۔ لہٰذا ہر فرد کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

اس کے بعد ذکر ہوا جس میں سب حاضرین نے شرکت کی اور عشاء کے بعد پروگرام مکمل ہوا۔ یوں ہمارا دِن کراچی سے چل کر ڈھاکہ میں تمام ہوا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

22 جنوری 1992ء:

شہر کے ساتھ ایک آبادی سے، جسے ڈیمرا کہتے ہیں، ایک ساتھی جو یہاں جلسہ میں آئے تھے، وہاں کے چیئر مین ہیں اور امیر آدمی ہیں۔ انہوں نے دوپہر اپنے گھر پر دعوت رکھی کہ سب ساتھی جمع ہوں گے چنانچہ لینے کو گاڑی آگئی۔ جو بھیڑ اور بدتمیزی میں نے ڈھاکہ کی سڑکوں پر دیکھی، اس کا کہیں اور کوئی تصور نہیں۔ مگر کمال یہ ہے کہ کوئی گاڑی ٹکراتی نہیں، نہ کسی راہگیر کو ٹکر لگتی ہے۔ اگرچہ پولیس بھی کھڑی ہوتی ہے مگر شاید صرف چلانے کے لیے، لوگ ہمت سے ہی راستہ بناتے ہیں۔ جہاں تک غلاظت اور بدبو کا تعلق ہے تو شہر کے ساتھ آبادی کے اندر ایک وسیع گڑھے کو پاٹا جا رہا تھا، جس میں ابھی نصف حصے پر سڑا ہوا پانی تقریباً چھ چھ فٹ کھڑا ہو گا اور سڑک کی طرف سے کمیٹی کی گاڑیاں کوڑا پھینک کر برابر کرتی جا رہی تھیں۔ کوڑا کرکٹ اور سڑے ہوئے پانی میں اگرچہ ناک بند رکھا، مگر اس کے باوجود اتنی شدید بدبو تھی کہ ہفتہ بھر بعد یہ سطور لکھ رہا ہوں، مگر ابھی زکام چل رہا ہے اگرچہ گولیاں بھی

کھاتا جارہا ہوں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان لوگوں کی صحت یا بقاء کا راز کیا ہے؟ ظاہر ہے اللہ قادر ہے جسے چاہے زندہ رکھے، ورنہ تو ظاہراً کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

خیر ظہر وہاں ادا کی، کھانا بھی اسی گھر پر تھا اور حسب معمول بغیر چینی تو تھی ہی، بغیر دودھ کے چائے ملی اور غالباً ہفتہ عشرہ اب دودھ کی چائے مشکل ہوگی۔ بھلا یہاں دودھ کہاں؟ بھینس کا تو نام نہیں، بکری، بھیڑ بھی ہم نے نہیں دیکھی۔ رہی گائے! تو اس کی ایسی نایاب نسل دیکھی جو گائے کم اور بیل زیادہ نظر آتی ہے اور ہے وہ بھی خال خال، تو دودھ کون دے گا؟ ولایتی خریدنا کارے دارد، لہٰذا سیدھا نسخہ یہ ہے کہ بھلا چائے میں بھی دودھ ہوا کرتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہاں یہ ہے کہ چکنائی سے کوئی خطرہ نہیں کہ گھی نام کی کوئی شے نہیں، بس تیل ہی تیل ہے، بے فکر ہو کر کھائیے بشرطیکہ آپ کھا سکیں کہ یہ پکاتے بھی اپنے طریقے سے ہیں جسے کھانے کا حوصلہ اور فن دونوں چاہئیں۔

ہاں! البتہ شوگر یا میٹھے سے پرہیز بہت ضروری ہے، اور یہاں ایک خاص قسم کی مٹھاس بہت ضروری ہوتی ہے وہ یہ کہ کھجور کے درخت بہت ہیں۔ یہ ان کے تنے زخمی کر کے ساتھ برتن باندھ دیتے ہیں، جس میں قطرہ قطرہ رس ٹپکتا رہتا ہے اور بہت ہی میٹھا ہوتا ہے۔ اگر تازہ رس کے چند قطرے ملا لیں تو ایک گلاس بہترین شربت بن جاتا ہے۔ اسے رکھ چھوڑیں تو از خود جم جاتا ہے، پھر اس کی بھیلیاں سی کاٹ لیتے ہیں اور خوب میٹھا کرتے ہیں۔ بہر حال ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور عصر کے وقت واپس پہنچے۔

یہاں ایک جلسہ عام تھا اور احباب نے خوب شامیانے وغیرہ لگا کر سٹیج بنا رکھا تھا۔ عصر سے مغرب تک مقامی علماء حضرات کا خطاب تھا۔ مغرب کے بعد بندہ کا بیان، خطبۂ مسنونہ کے بعد آیت کریمہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی تلاوت کی۔ حاصل کلام ''ذکر کی ضرورت و اہمیت اور اس کے فوائد، نیز اس کے چھوڑ دینے کے نقصانات'' کا بیان تھا۔ میری نگاہ میں تو مسلمان عبادات سے بڑی حد تک محروم ہو چکا ہے جس کا ایک بہت بڑا سبب اس کی ضروریات ہیں۔ مادی ضروریات کی تکمیل کے بغیر مادی زندگی کا

کوئی تصور نہیں، مگر اسلام نے مادی ضروریات پوری کرنے سے روکا تو نہیں۔ ہاں! انہیں پورا کرنے کے بہت خوبصورت طریقے بتائے ہیں۔ مگر ہماری مصیبت یہ ہے کہ اسلامی احکام ہمیں بوجھ لگتے ہیں اور ان پر عمل ہمارے لیے ایک بہت بڑی مشکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو لوگ عبادات میں بھی کوتاہی کرتے ہیں، انہیں چھوڑ بھی دیں تو اچھا بھلا عبادت گزار بھی جب بازار جاتا ہے تو اس کا کردار ایک چور کا کردار بن جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جب ہم مسلمان ہیں تو ہم دین پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اور کیوں حلال وحرام کی پروا نہیں کرتے؟ اس لیے کہ دماغ تو سلامت ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ وہ مادی ضروریات کا ادراک بھی کرتے ہیں اور ان کی تکمیل کے راستے بھی تلاش کرتے ہیں۔ اب اس مادی ذہن کو اس راستے پر ڈالنا جو اللہ نے بتایا ہے کہ دُنیا کے ساتھ آخرت کی نعمتیں بھی حاصل کر سکے، یہ دل کا کام ہے، اور دل سو رہے ہیں۔ کتنے دل ہیں جو ذاکر ہیں، اور کتنے قلوب ہیں جن میں اللہ کی تجلیات جلوہ فگن ہیں؟ غالباً ایک بہت بڑی آبادی میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی نہیں۔ تو پھر دین پر عمل کیسے ہوگا؟ غرض ڈیڑھ گھنٹے کا بیان طویل تھا جس میں شاید آپ کو الجھائے رکھنا مناسب نہیں۔ ہاں! بیان کے بعد اس میدان میں ذکر ہوا اور الحمد للہ! کہ سارے سامعین ذکر کر رہے تھے۔ چلو! ایک بار سہی، مگر ذکر قلبی کی لذت سے آشنا تو ہوئے۔ عشاء ادا کی اور بہت سے لوگ بیعت ہوئے۔ یوں ہم گھر پہنچے، کھانا کھایا، آرام کرنے چلے تو بھلا مچھر کہاں آرام کرنے دیں گے۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ کراچی اور ڈھاکہ میں ایک ہی قبیلہ کے مچھر بستے ہیں، اور شاید آپس میں رشتہ داریاں بھی ہوں کہ سنا ہے مچھر بڑی دھوم دھام سے شادیاں کرتے ہیں، واللہ اعلم۔ ویسے ان کی باراتیں جاتی تو آپ نے بھی یقیناً دیکھی ہوں گی۔ اور یہ تو مزے سے جہاز میں بھی سفر کرتے ہیں۔ آپ کراچی یا ڈھاکہ سے کسی بھی سمت روانہ ہوں، جہاز میں مچھر ضرور ہم سفر ہوگا۔ انہیں کون سا کرایہ دینا ہوتا ہے، لہٰذا یہ بھی نہیں پوچھتے کہ جہاز کہاں جا رہا ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ یہ دونوں نرم مزاج واقع ہوئے ہیں، کاٹتے

ضرور ہیں مگر زخمی نہیں کرتے، جبکہ ہمارے علاقے کا مچھر کاٹے تو آدمی تڑپ اٹھتا ہے اور جہاں جہاں کاٹتا ہے صبح وہاں خون جما ہوا ہوتا ہے۔ یہ ذرا سی نرمی برتتے ہیں کہ کاٹنے کی جگہ ضرور سرخ سی ہو جاتی ہے، مگر خون نہیں جما ہوتا۔ بس! انہی سے لڑتے بھڑتے رات گزر گئی، کبھی نیند نے سلا دیا اور کبھی مچھر نے جگا دیا۔ ہم اسے بھی انجوائے ہی کرتے رہے

23-جنوری 1992:

علی الصبح جب اٹھا، اور یہ بھی عرض کر دوں کہ علی الصبح سے میری مراد ہے جب نماز فجر کے بعد آرام کر کے ناشتے کے لیے جاگا تو باتھ روم گیا۔ میں دوسری منزل پر تھا، جو ڈھاکہ میں تیسری ہوا کرتی ہے کہ ایک منزل کی یا تو کرسی ہوتی ہے، یا پھر پلر (Piller) بنے ہوتے ہیں اور نیچے پانی کھڑا ہوتا ہے۔ اور باتھ روم برآمدے کے دوسرے کونے پر تھا کہ پورے کمرے کے گرد گھوم کر جانا پڑتا۔ مکان کے عین پیچھے ایک بہت گندا سڑے ہوئے پانی کا جوہڑ تھا جس کے تین اطراف گھر بنے ہوئے تھے اور ایک کنارے پر کھیت تھے۔ پانی خشک ہوتے ہوتے کافی تھوڑا رہ گیا تھا جو بالکل سیاہ رنگ کا اور بہت بدبودار تھا۔ وہاں چند خواتین جمع تھیں۔ میں کتنی دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ یہ کتنے باکمال لوگ ہیں، گندے پانی میں ہر شے صاف کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک خاتون برتن دھو رہی تھی، ایک غسل کر رہی تھی اور چند بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں، جبکہ عین اس وقت بھی کنارے کے ایک گھر سے ایک خاتون نے گھر کا کوڑا کرکٹ اس میں پھینکا۔ اور ایک لیٹرین بھی کنارے پر بنی تھی۔ یہ بھی عجیب دستور ہے۔ بانس گاڑ کر ان پر چھت سی ڈال کر ارد گرد پرانی بوریوں کے پردے ڈال لیتے ہیں اور اسی چھت کو جیسے فرش بنا لیتے ہیں، اور بانس بلند کر کے اوپر چھت ڈالتے ہیں تو نیچے والے میں سوراخ رکھتے ہیں اور اپروچ بھی بانسوں کی معلق پل کی طرح بنا دیتے ہیں اور کبھی غلاظت صاف نہیں کرتے۔ نیچے پانی میں تیرتی پھر رہی ہوتی ہے۔ اور وہاں اس روز تو بہت ہی حیرت ہوئی۔ مگر پھر دیکھا کہ وہاں غسل کا جو طریقہ خواتین میں بہت عام ہے کہ ساڑھی سمیت پانی میں اتر کر نہا لیا اور ساڑھی نچوڑتی ہوئی باہر آ گئیں، باہر خشک ساڑھی کھڑے کھڑے لپیٹ

لی۔ وہ پانی کم تھا، لہٰذا خاتون کنارے پر بیٹھی برتن سے پانی اوپر ڈال رہی تھی۔ مرد حضرات بھی اکثر ایسا ہی کرتے ہیں۔ ناشتہ کے بعد "شیراج ڈی کھان" جانا تھا۔ یہ دراصل کوئی صاحب سراج الدین خان گزرے ہیں جن کے نام پر تا حال گاؤں آباد ہے، ان کا نام نامی بگڑ کر "شیراج ڈی کھان" بن گیا۔ میجر زین العابدین خان اور ان کے دوست نے ہمراہ ہونا تھا۔ کرنل محبوب صاحب اور میں بھی ساتھ چلے، کار نے سارے شہر کی سیر کرائی اور آخر بوڑھی گنگا کے کنارے پہنچے۔ دریائے گنگا بنگلہ دیش میں داخل ہونے سے قبل دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ دریائے جمنا سے مل کر پدما کہلاتا ہے، اور دوسرا بوڑھی گنگا۔ بوڑھی گنگا ڈھاکہ کو چھوتی ہوئی گزرا کرتی تھی۔ اب دونوں کناروں پر شہر ہے۔ پہلے صرف کشتی اور جہاز سے عبور ہوتا تھا۔ اب ایک خوبصورت پل چین نے بنایا ہے جس کا نام ہی بنگلہ دیش چین دوستی پل ہے۔ بہت خوبصورت، مضبوط اور بلند ہے۔ نیچے سے جہاز گزر جاتے ہیں۔ اس سے گزرے تو چند میلوں بعد پھر دریا آ گیا مگر اس پر پل نہ تھا، فیری (بڑی کشتیاں) تھیں۔ بہت بڑی بڑی کشتیاں، جو بسیں، کاریں اور انسان سب کچھ لاد اور دوسرے کنارے۔ اِدھر سے اٹھا اور اُدھر، درمیان میں کھلی جگہ۔ دونوں کناروں پر پان بیڑی اور فروٹ وغیرہ کے کھوکھے جو ساتھ ساتھ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیرتے پھرتے تھے۔ چند میل بعد پھر ایک دریا اور ایسے ہی فیری کا مسئلہ، وہاں سے گزرے تو گاؤں کو گھوم گئے۔ اب راستہ پل صراط سا ہو گیا تھا کہ کھیتوں سے تقریباً 10 فٹ بلندی اور بمشکل گاڑی چل سکتی تھی۔ چوڑائی میں بہت کم، آگے ایک منی بس تھی۔ گزرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ چند میلوں کے بعد ایک ہلکا اور نازک سا پل آ گیا جس پر سے سواریاں الگ اور گاڑی الگ ہو کر گزرتے، اور دوسرے کنارے اتر کر سواریاں بے تابانہ گاڑی کو لپکتی تھیں۔ جب منی بس رکی تو ہماری کار بھی رک گئی۔ نیچے اترے تو بس کی سواریاں اتر رہی تھیں۔ عجیب بات ہے! یہ ہندوؤں کی بارات تھی اور ہندو دیویاں روائتی سج دھج سے لجاتی شرماتی اتر رہی تھیں۔ ہمیں 42-برس پہلے کا زمانہ یاد آیا جب ہمارے علاقے میں دولت عموماً ہندوؤں ہی کے پاس ہوا کرتی

تھی اور ہندو عورتیں بہت بن سنور کر رہتی تھیں۔ بیاہ شادی بڑی دھوم دھام سے کیا کرتے تھے۔ہم دونوں منظر دیکھ رہے تھے کہ آواز آئی، کار دوسرے کنارے پہنچ گئی ہے۔ پل کے نیچے تو ایک بوڑھا ہندو لنگوٹ کسے پانی میں کھڑا تھا۔ ذرا پرے ایک نازک اندام سی ادھیڑ عمر خاتون کمر تک پانی میں کھڑی دونوں ہاتھ باندھے پرنام کر رہی تھی۔ وہ باہر نکلی، ساڑھی نچوڑتی ہوئی چلی گئی اور ہم بھی بابا کو کھڑا چھوڑ کر چل دیئے۔ ہماری منزل قریب ہی تھی۔ ان دو احباب نے بنگلہ دیش میں اسلامی اُمہ کارپوریشن لمیٹڈ کے نام سے ایک ادارہ بنایا ہے جس کے ذریعے یہ اسلامی معیشت کا نظام رائج کرنے کے آرزو مند ہیں۔ اس کا طریق کار بالکل بنک ہی کی طرح ہے کہ جو بھی پیسہ دے، اس کا اکاؤنٹ کھل گیا اور کارپوریشن وہ رقوم کاروبار پر لگاتی ہے اور منافع سب پر تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ جس میں ان کا اندازہ ہے کہ بنک کی نسبت بہر حال بہت زیادہ نفع ملتا ہے۔ یہاں ان کے دو منصوبے تھے، ایک مرغی خانے کا اور ایک رائس مل کا۔ ہم نے دیکھا یہ گاؤں بھی ایک دریا کے کنارے ہے اور دور دور تک خوبصورت کھیت پھیلے ہوئے ہیں، اور اب تو دریا کنارے لوگوں نے جگہ جگہ چھوٹے انجن لگا کر آبپاشی شروع کر رکھی ہے اور خوب محنت کرتے نظر آتے ہیں۔ اللہ کرے کبھی ان غریبوں کے مصائب بھی ختم ہوں۔ واپسی کا راستہ پھر سے وہی تھا۔ دو عدد فیری کراسنگ اور پھر بڑا پل۔ وہاں سے ہم نارائن گنج کو مڑ گئے جو ڈھاکہ سے قریب دوسرا بڑا شہر ہے اور مرکزی تجارتی منڈی بھی ہے۔ زیادہ مال جو دریا کے راستے جاتا ہے، وہ یہیں سے جاتا ہے۔ ہمیں یہاں پہنچتے مغرب ہوگئی۔ جس محلے میں ہمیں جانا تھا، اس کا نام ''ڈیو بھوگ'' ہے یعنی ''شیطان کا کھانا'' اور یہ نام اس لیے بھی ہے کہ سارا محلہ ہندوؤں کا ہے جو یہاں کی معیشت پر بڑی حد تک قابض ہیں۔ عین مرکز میں اللہ نے مولانا الطاف صاحب کو ہمت بخشی کہ انہوں نے مذہبی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اب اس کی مسجد بہت بڑی ہے اور ساتھ ایک بڑی عمارت مدرسہ اور ہوٹل کی ہے۔ تقریباً پانچ صد طلبہ یہاں تعلیم پاتے ہیں اور بڑے بڑے فاضل اساتذہ موجود ہیں۔ ملاقات کر کے بہت سعادت نصیب ہوئی اور دلی مسرت ہوئی۔ مغرب سے عشاء تک

بیان ہوا، جس میں بندہ نے توطلباء کو یہی تاکید کی کہ علم توضرور حاصل کریں مگراس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ صرف امام مسجد یا خطیب بن جائیں بلکہ واپس میدان عمل میں جائیں، کاروبار اور ملازمت کریں، کھیتی باڑی کریں۔ سیاست میں حصہ لیں اور یہ ثابت کریں کہ دین جاننے والا مسلمان کتنا مفید اور کس قدر بہتر انسان ہوتا ہے تاکہ نہ صرف مسلمانوں میں دین سیکھنے کا جذبہ پیدا ہو بلکہ غیر مسلم بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی اکرم ﷺ سے دین حاصل کیا تو وہ سیدھے میدانِ عمل میں اترے۔ محض مساجد بنا کر بیٹھ نہیں گئے کہ آنے جانے والوں سے چندے کرتے بلکہ جہاد، تجارت، کھیتی باڑی، سیاست، معیشت اور اخلاقیات، غرض ہر میدانِ عمل میں اپنا سکہ منوایا، جس کے باعث کفار بھی مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے۔ آج یہ ضرورت ہے کہ ہم ثابت کریں کہ دینی علم رکھنے والے کتنے اچھے اور کام کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں سے قیام گاہ پہنچتے ہوئے کافی وقت ہو گیا اور دِن بھر کا سفر تھکا دینے والا بھی تھا، لہٰذا جو نصیب تھا کھایا اور آرام کیا۔ بنگلہ دیش کا کھانا بھی میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ اللہ کی یہ مخلوق کیسے زندگی بسر کرتی ہے، اور اگر یہی کچھ کھا کر زندگی گزارتے ہیں تو واقعی کمال کرتے ہیں۔ وہ جو کسی نے کہا تھا" جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں،، بس وہی بات صادق آتی ہے، کچھ ہر دیس کا رواج، طریقہ، موسم اور اوقات تک اپنے ہوتے ہیں۔ یہ تو محض اللہ کا کرم ہے کہ اتنے کم وقت میں دُنیا کے گرد گھوم جاؤ اور معدہ، ذہن اور بدن یہ سب کچھ برداشت کرتا چلا جائے۔ یہ ایک بہت مشکل کام ہے جو تائید الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں اللہ کرے کچھ لوگوں کے قلوب یادِ الٰہی سے روشن ہو جائیں تو ساری محنت کا صلہ مل گیا۔

24-جنوری 1992:

آج جمعہ کا روز تھا اور کئی دِنوں بعد غسل نصیب ہوا۔ احباب تو کہتے رہے کہ پانی گرم کر دیتے ہیں مگر بس کچھ طبیعت کی خرابی، وقت کی کمی اور غسل خانے کی صورتحال، سب کچھ ایسا تھا

کہ غسل ہی نہ کر سکا۔ آج نہا کر کپڑے تبدیل کیے۔ بیعت کے لیے بہت سے احباب آ گئے تھے۔ ان سے ملے اور پہلا وقت خواتین سے بیعت لینے اور ملاقات کا تھا، جو ترجمان کی وساطت سے ہوسکا۔ دوپہر فارغ ہو کر جامع مسجد "باشابو" جانا تھا جو ایک بہت بڑا مدرسہ اور مرکزی مسجد بھی ہے۔ حادثہ یہ ہوا کہ ہماری گاڑی نہ پہنچ سکی جو ایک شدید مریض کو لے کر ہسپتال چلی گئی تھی۔ میں نے تو کہا پیدل چلتے ہیں، مگر احباب کا خیال تھا کہ بازار اتنا تنگ اور ٹریفک اتنی زیادہ ہے کہ آپ راستہ نہ پا سکیں گے اور لیٹ ہو جائیں گے۔ وہ سائیکل رکشہ لے آئے جس کو ایک آدمی چلاتا ہے اور دو پیچھے سواری کرتے ہیں۔ مجھے تو واقعی عجیب لگتا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں چند ایک اور بہاولپور میں بہت زیادہ ہیں، مگر کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اس پر بھی سواری کرنا پڑے گی۔ ناچار اس پر بیٹھنا پڑا۔ اگرچہ میں اکیلا ہی بیٹھا تھا مگر ایک تو وہ بہت تکلیف دہ اور آگے کو جھکی ہوئی سیٹ، اس پر یہ احمقانہ سواری، کہ جس پر بیٹھا ہوا سوار سب سے بڑا احمق لگتا ہے۔ مگر کیا کرتے، شرمندہ شرمندہ بیٹھ گئے اور بڑی خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ لوگ ہم پر ہنسنے کے بجائے الٹا سلام کرتے چلے جاتے تھے اور یہ چلانے والے کی مہارت کہ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔ یوں آہستہ آہستہ ہم بھی دلیر ہو گئے اور اگر لوگوں نے ہمیں بیوقوف نہ سمجھا، تو ہم انہیں بیوقوف سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ لہٰذا اس طرح خود کو تسلی دے کر چلتے رہے، اور اللہ کا شکر ہے کہ بغیر کسی حادثے کے منزل پر پہنچ گئے۔ اگرچہ جب بھی ذرا سا دھکا لگتا تو سمجھ میں یہی آتا کہ ہم گرے کہ گرے، مگر بچ ہی گئے۔ مسجد میں حضرات منتظر تھے۔ چائے کا دور چلا جو حسب معمول بغیر دودھ کے تھی اور پھر جمعہ کا بیان، وہی جو ہمارا خاص موضوع ہے کہ اللہ کریم کے نام کا ذکر کیا جائے۔ لوگوں کو بات بہت پسند آئی مگر ہمارے پاس وہاں رکنے کا وقت نہ تھا۔ چلنے لگے تو وہی رکشہ، تو میں نے معذرت کر لی۔ ساتھی بولے بے بی ٹیکسی لے آتے ہیں۔ جب وہ ٹیکسی آئی تو وہ نیا موٹر رکشہ تھا جس کے پیچھے پک اپ کی طرح باڈی اور دونوں طرف بنچ لگے ہوئے تھے۔ چلو! یہ اس سے تو بھلا ہے کہ کم از کم کسی انسان کی پیٹھ پر تو سوار نہ ہوں گے۔ اس میں بیٹھے تو عجب حال ہوا، ایک کے گھٹنے دوسرے کے گھٹنوں

میں پھنس گئے اور یوں ایک زنجیر میں سب بندھ گئے۔ اب جو چلا تو حال کھلا کہ یہ تو کوئی بہت ہی دل جلا تھا اور اس غریب کا تو جگر کباب ہو رہا تھا، جس کی بد بو نے دماغ پھاڑ دیا۔ یا اللہ! یہ کیا مصیبت ہے۔ پہلے رکشے پر بیٹھے تھے تو ویسے شرمندگی محسوس ہوتی تھی اور حیرت بھی کہ تانگے کا گھوڑا دیکھنے کو تو محکمہ بے رحمی حیوانات موجود ہے کہ جانور مرہی نہ جائے مگر انسان کی فکر کس کو؟ اگر مر بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا۔ آبادی تو پہلے ہی زیادہ ہے، چلو منصوبہ بندی ہو جائے گی۔ اور یہ جو دوسرا پلے پڑا تو کوئی زیادہ ہی عشق کا مارا ہوا لگا اور اس کا جگر جلنے کی بو تو محلے میں پھیل رہی ہوگی۔ اسی ادھیڑبن میں تھے کہ وہ دو چار بار کھانس کر خاموش ہو گیا۔ سمجھے چل بسا مگر ڈرائیور نیچے اُترا، سیٹ الٹی کر کے کچھ چھیڑ چھاڑ کی اور ہینڈل گھمایا تو پھر سے لگا شاعری کرنے اور دھواں چھوڑنے کہ حقہ پیتا ہے، شعر کہتا ہے اور ''شاعر'' میں کیا برائی ہے۔ بھئی! ہم نے کب کہا، برائی اس میں ہے، ہماری گزارش تو یہ ہے کہ ہم میں قوت برداشت کم ہے۔ چنانچہ یوں افتاں وخیزاں بہ حال خراب، ہم میجر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچے جہاں سے رات ہمیں ڈامڈا (Damudda) روانہ ہونا تھا۔ یہ جگہ اپنے نام کی طرح بہت گول مول اور عجیب وغریب ہے، اور اس تک پہنچنے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑا، یہ الگ داستان ہے۔ اگر آپ شوق رکھتے ہیں تو ضرور سنیے کہ ہم نے مغرب تو وہیں ادا کی، ذکر کیا، عشاء پڑھی، کھانا کھایا اور اب ہمیں گھاٹ پر جانا تھا جہاں سے بوٹ (Boat) میں سوار ہونا تھا۔ اس کے لیے پھر وہی بے بی ٹیکسی آئی۔ ڈھاکہ میں سواریاں عجیب وغریب ہیں۔ میں نے پوچھ لیا کہ آپ دیہات میں کیا کرتے ہیں؟ تو بتانے لگے کہ دیہات میں ہیلی کاپٹر ہوتا ہے۔ کمال ہے! ہیلی کاپٹر اور آپ کے دیہات میں؟ تو انہوں نے بتایا کہ کھیتوں میں کیچڑ تھوپ کر اونچا راستہ بنایا جاتا ہے۔ جس کے گرد تو کھیت پانی سے بھرے ہوتے ہیں اور راستے کی چوڑائی کم کہ اس پر نہ رکشہ چل سکتا ہے، نہ بے بی ٹیکسی، تو اس پر ہیلی کاپٹر چلاتے ہیں۔ ہیلی کاپٹر راہ پر چلاتے ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی! تو کہنے لگے: اب سمجھے، آپ ہیلی کاپٹر نہیں جانتے؟ بھئی سائیکل کو جس طرح پیچھے کیریئر لگا ہوتا ہے، ویسا ایک آگے لگا لیتے ہیں، اور دو آدمی پیچھے، دو آگے بٹھا کر سائیکل والا لے جاتا

ہے۔اس سائیکل کو ہیلی کاپٹر کہتے ہیں۔سبحان اللہ! نام کیسے ہیں اور کام کیا ہیں۔خیر! ہماری ٹیکسی آگئی، بیٹھ تو گئے ہم، اور اس میں یہ بھی کمال ہے کہ آپ اگر اندر بیٹھ گئے تو دو جہاں سے کٹ گئے۔اب آپ کا پتہ نشان منزل ہی پہ ملے گا، کم ازکم میرا تاثر تو یہی تھا۔اب وہ جو چلی تو راز کھلا کہ عشق خانہ خراب نے تو اس کا دامن بھی تار تار کر رکھا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ رکشے کا دامن بھی تو اس کی چھت پہ ہوتا ہے جس میں سے جا بجا گلی کی روشنیاں جھانک رہی تھیں اور جب چلا تو گرد کے غبارے سیدھے اندر آ کر گرتے مگر مجنوں بلا کا تھا، چلا اور بس چلتا ہی گیا۔ کبھی الٹے ہاتھ، کبھی سیدھے ہاتھ، کبھی بس کے آگے اور کبھی کار سے پیچھے۔پتا نہیں وہ رکشوں کے ہجوم سے کیسے نکلا۔اپنا تو ڈر کے مارے دم نکلا جا رہا تھا کہ ابھی کسی گاڑی سے ٹکرائے گا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے گا، مگر ڈرائیور کی مہارت کہ گھاٹ پر لے آیا۔یا خدا! جو شور اور ہنگامہ یہاں بپا تھا، کہیں دیکھا نہ سنا۔شاید یہ بنگالی لوگ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے گلے کا زور استعمال کرتے ہیں اور سب لوگ اس کے عادی ہیں، کوئی پروا نہیں کرتا۔ایک تختے پر سے گزر کر بوٹ (Boat) کے اندر پہنچے تو مخلوق گڈمڈ ہو رہی تھی۔کوئی نہیں جانتا کون بچہ کس کے ساتھ ہے؟ اور کس کی بیوی کہاں بیٹھی ہے؟ یا کس کا بابا کس کونے میں پڑا ہے؟ ایک طوفان تھا لوگوں کا جو کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔تین چار باوردی گارڈز ساتھ ہوتے ہیں، انہوں نے ہماری مدد کی۔ایک آگے لگا اور ایک پیچھے، دونوں مسلسل سیٹیاں بجا رہے تھے۔یوں ہمیں وہ دوسری منزل پہ لے آئے جہاں ہمارے دو کیبن مختص تھے۔ایک میرے اور کرنل محبوب خان کے لیے اور دوسرا باقی ساتھیوں کے لیے۔کیبن کے اندر 2-فٹ چوڑے اور 4فٹ اونچے دو تختے بالمقابل لگے ہوئے تھے، جو بیڈ کہلاتے تھے۔تقریباً 3 فٹ جگہ اوپر چھت تک تھی۔ایک کونے میں لائٹ تھی اور دو فٹ جگہ درمیان میں ہوگی اور بس۔سامان نیچے رکھیں، خود اوپر لیٹ جائیں۔اردگرد بھی بہت سی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔حال سب کا یہی تھا اور ہر طرف بے پناہ بھیڑ تھی۔آدمی بہت مشکل سے ادھر ادھر آ جا سکتا تھا۔تھوڑی دیر بعد احباب نے ایک سنگل کیبن ڈھونڈ نکالا اور مجھے وہاں چلنے کو کہا۔بھئی! ہو بہو قبر کی یاد تازہ کر رہا تھا اور

گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا، اوپر سے مچھروں کی یلغار۔ ساتھی کھانا لے آیا، کھانا عجیب تر تھا۔ بھئی! یہ کیا ہے؟ "مرغ پکا ہے"۔ بھئی! یہ کیسے پکا ہے؟ "اجی! دودھ میں پکایا ہے، آپ کی خاطر"۔ سبحان اللہ! دودھ کے پھنکرے الگ تیر رہے تھے اور مرغ کے ٹکرے اپنی جگہ نادم سے لگ رہے تھے۔ یار! میں نے تو آپ سے کہا تھا دال پکا لینا، "جی وہ بھی ہے" بھئی! یہ اس میں کیا ہے؟ "جناب! یہ مچھلی ملا کر دال پکائی ہے"۔ سبحان اللہ! نہ دال رہی نہ مچھلی بنی، تو بھئی کوئی ہری مرچ دے دو، سالن کا دھوکہ خود کو دیں گے اور دو چھلکے مرچ سے کھائیں گے۔ مرچ ایسی بے باک ہوتی ہے کہ ذرا منہ سے لگے تو پندرہ بیس منٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اوپر سے مچھروں کو عشق کی سختیوں سے نجات دلانے کو ایک چھپکلی آ گئی۔ اب جو اس نے اچھل کود مچائی تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ابھی سالن میں گرے گی۔ مگر خیر گزری، چند مچھر ہی گر کر یہ سعادت پا سکے۔ چنانچہ جو نصیب تھا کھایا اور واپسی چاہی کہ اس مار دھاڑ میں، نیز گھٹن اور گرمی میں گزارہ مشکل ہے۔ ہاں! آپ سب لوگ بھی کھانا اسی جگہ کھا لو۔ واپس جاتے ہوئے غسل خانے چلا گیا اور اس کا فرش اونچا تھا، بے تکلفی سے اندر داخل ہوا تو زوردار دھماکہ ہوا اور چکر آنے لگے۔ کچھ دیر بعد سمجھ میں آیا کہ یہ تو اپنا ہی سر چھت سے ٹکرایا تھا۔ اب جو دیکھا تو چاروں دیواروں پر بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ جتنی دیوار اتنا بڑا شیشہ۔ یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکا کہ رفع حاجت کو جانے والوں کو ان آئینوں کی کیا ضرورت تھی؟ آدمی بیٹھتا تو ایک تماشا نظر آتا کہ ہر طرف وہ خود ہی بیٹھا ہے۔ اپنی پریشانی سے خود ہی لطف اندوز ہوتا اور خود کو اپنی تصویروں کی نظر سے بچانے کی سعی کرتا ہے۔ خیر! ہم سر پر معمولی سا زخم لے کر واپس جہاں سے چلے تھے وہاں پہنچے۔ اس کیبن کا ایک پہلو باہر تھا اور دریا کی ہوا آزادانہ آتی تھی، چنانچہ ٹھنڈا خوب تھا۔ کمبل ساتھ لائے تھے۔ لپیٹا اور پڑ رہے، خطرہ یہ کہ تختے سے گرے تو خوب چوٹ لگے گی۔ بڑے ماہرانہ انداز میں ایک پہلو پر لیٹ گئے، رات گیارہ بجے سے وقت اوپر جا رہا تھا۔ کشتی 9:30 پر تو نکلی تھی لہٰذا اونگھ سی آ ہی گئی کہ دن بھر بھی آرام نہ کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بہت شور اٹھا اور دھڑام، گھڑام شڑپ، چیزیں اوپر نیچے گرنے لگیں۔ لوگ بھی چلائے جا رہے تھے، سمجھے

منزل آ گئی۔ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھے تو پتا چلا کہ 12- بجنے والے ہیں اور Fog (دھند) اس قدر ہے کہ چلنا ممکن نہیں، لہٰذا لنگر ڈال دیا گیا۔ اسی کے جھٹکے سے کشتی رکی تو انسان اور اشیاء سب اُلٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔ پتا کیا کہ کیا کوئی رابطہ کا اہتمام ہے کہ کسی کو بتا سکیں کہ ہم کہاں ہیں؟ یا کوئی Maps (نقشہ) وغیرہ کہ اندازہ ہو سمت کون سی اختیار کرنی ہے؟ تو کچھ بھی نہیں، بس! محض اللہ پر بھروسہ سے فاگ (دھند) ہٹے گی، ستارے نظر آئیں گے تو پتا چلے گا کیونکہ جہاں ہم ہیں یہاں بوڑھی گنگا، پدما اور تین اور دریا مل کر بیس سے پچیس میل دریا کا پاٹ چوڑا کر دیتے ہیں۔ لہٰذا راستہ نظر آئے گا تو چل سکیں گے۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ بنگال کے دریا اپنے ساتھ مٹی بہت لاتے ہیں، اور پھر کسی کسی جگہ مٹی جمع ہو کر نیا جزیرہ ابھر آتا ہے۔ بوٹ (Boat) کو خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کسی ابھرتے ہوئے جزیرے پر نہ چڑھ جائے، ورنہ پھر شاید نکالنے میں ہفتہ بھر لگ جائے گا۔ شاباشے! بھئی آرام سے لیٹ گئے۔ فجر کے وقت سے ذرا پہلے اٹھے، تہجد ادا کی، ذکر ہوا اور پھر فجر۔ چائے وغیرہ رات کی ساتھ تھی، دودھ تو گوشت میں تھا، چائے کے ایسے نصیب کہاں؟ غرض دِن ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پھر سے روانگی کا اعلان ہوا، اور چار آدمی وہ چرخی گھمانے لگے جو لنگر اٹھاتی ہے۔ ہم بھی چھت پر گئے جہاں کیپٹن کا کیبن تھا جس میں وہی پرانا وہیل لگا ہوا تھا اور ایک آدمی باہر کھڑا ذرا دائیں، تھوڑا بائیں بتاتا جا رہا تھا۔ وہاں کھڑے کنارِ دریا کا تماشہ کرتے گئے کہ انہوں نے کشتی ایک کنارے کے ساتھ کر لی تھی جہاں دو تین جگہ انہیں سواریاں اتارنا تھیں۔ بہر حال لوگوں کو دیکھا، عموماً خواتین تھیں۔ اس وقت ایک ایک پیتل کی گاگر کمر کے ساتھ لگائے، بازو میں ڈالے دریا پر آ رہی تھیں۔ پانی میں اتر کر مزے سے غسل کرتیں، باہر نکل کر ساڑھی نچوڑتیں اور گاگر بھر کر چلی جاتی تھیں۔ بعض خشک ساڑھیاں بھی لائی تھیں جو وہیں کھڑے کھڑے بدل لیتی تھیں۔ کنارے پر اینٹوں کے بھٹے بھی جگہ جگہ تھے، دریا کنارے شاید اس لیے تھے کہ اینٹیں ادھر ادھر دریا کے راستے جاتی تھیں۔ نیز جس قدر بجری کی ضرورت ہوتی ہے، مکان بنانا ہو یا فرش ڈالنا، بلکہ سڑک بنانے

کے لیے بھی اینٹ ہی کوٹ کر بنائی جاتی ہے، اور یہ کام اکثر عورتیں کرتی ہیں۔ جگہ جگہ آپ کو بجری کوٹتی ہوئی نظر آئیں گی۔ دریا میں اب ہر طرف کشتیاں دوڑ رہی تھیں اور اس کے کنارے بھی سمٹ رہے تھے۔ شاید پانی پھر سے کئی دریاؤں میں بٹ گیا تھا۔ یہ کشتیاں ماہی گیری کے لیے تھیں جن میں عموماً دو دو لڑکے تھے جو بڑی مہارت سے بھگاتے اور جال پھینکتے پھرتے تھے۔ بعض کشتیاں بڑی تھیں، ان میں موٹر تھی اور آدمی بھی زیادہ تھے۔ یہ میلہ دیکھتے ہوئے ہم فجر کی بجائے ظہر کے وقت پوری رات اور آدھا دن سمندر نما دریا میں بسر کر کے ''ڈاﺅڈا'' پہنچ گئے۔ طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ گلے میں درد اور نزلہ ہو رہا تھا۔ کنارِ دریا اسلامی اُمہ کارپوریشن لمیٹڈ کا دفتر تھا، جہاں ظہر ادا کی اور گرم چائے کا ایک کپ پیا جس میں دودھ بھی تھا۔ ایک ساتھی کے گھر آرام کرنا تھا جہاں قریب سرکاری ہسپتال بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے، انہوں نے کچھ گولیاں تجویز کیں جو ساتھیوں نے منگوائیں۔ تھوڑی دیر آرام کیا، چند ساتھی فروٹ لے آئے، ایک عجیب ستارہ نما شے تھی یعنی خوبصورت پانچ کونوں والی ٹکیاں سی، اور کھاؤ تو بہت ترش، نمک لگایا تو ذرا مناسب لگیں۔ پتا چلا کہ یہ وہ شئے ہے جس سے شوگر کے مریض کے لیے ڈاؤنل کی گولی بنائی جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی ملا، کچھ چاول کھا لیے جو پھر رات کو بھی کفایت کر گئے۔

یہ ''ڈاﺅڈا'' ضلع شریعت پور کا تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ شریعت پور کا پہلا نام فرید پور تھا۔ یہی ضلع عوامی لیگ کا گڑھ تھا اور مکتی باہنی کا مضبوط مرکز، اس کا بیشتر علاقہ جنگلات پر مشتمل ہے۔ عوامی لیگ کا اب بھی یہاں زور ہے اور ناجائز اسلحہ یہاں عام ہے مگر اس سے بھی خطرناک تنظیم ''شربوہرا'' ہے، جس کا معنی ہے ''تہی دست''۔ یہ سب کمیونسٹ ہیں اور ڈاکہ ان کا پیشہ ہے۔ یہ سب مغربی پاکستان ہی کے خلاف نہ لڑے بلکہ بنگلہ دیش کی حکومت کے سامنے بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ ان کا لیڈر شیراج شٹر دل تھا۔ شیراج تو سراج کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور شٹر دل غالباً شیر دل کو بگاڑا گیا ہے جسے شیخ مجیب نے خفیہ طور پر گولی مروا دی تھی کہ ہتھیار نہیں ڈال رہا تھا، اور انہوں نے اب تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ گویا یہاں ہمارے

ساتھ دشمنی کرنے والوں کی تعداد اب بھی بہت ہے، اور سب مسلح ہیں۔ مغرب کے بعد جلسہ تھا۔ جلسہ گاہ کے لیے ساتھی وہی رکشہ لے آئے۔ میں نے تو پیدل چلنے کو ترجیح دی کہ ساتھیوں کے مطابق چوتھائی میل کا فاصلہ تھا۔ دوسرے لوگ رکشوں پر چلے گئے۔ چند ساتھی میرے ساتھ چلے۔ جب کئی میل چل چکے تو پوچھا کتنا سفر باقی ہے؟ تو کہنے لگے: بس! آدھا ہوگا۔ کمال ہے! آپ کا چوتھائی میل دو میل کا ہوتا ہے! کہنے لگے: اب رکشہ رو کتے ہیں، مگر میں نے کہا: خیر ہے! چلو۔ چنانچہ دوسری طرف دریا کنارے پہنچے اور وہاں سے چھوٹی کشتی میں دریا عبور کیا تو کنارے پر رائس مل کا گراؤنڈ بطور جلسہ گاہ استعمال ہورہا تھا، جہاں اس وقت مغرب کی اذان ہورہی تھی۔ نماز ادا کی، دو مقامی علماء نے کچھ وقت لیا اور پھر بندہ نے بیان کیا جو گھنٹہ بھر جاری رہا۔ الحمدللہ! مسلمان کی موجودہ دور کی ضرورت بھی زیر بحث آئی اور آخرت کی اہمیت بھی۔ بیان کے بعد ذکر ہوا جس میں سب اہل جلسہ شریک ہوئے۔ خواتین کے لیے پردے کا اہتمام تھا۔ ذکر کے بعد عشاء پڑھی۔ بہت سے لوگ بیعت ہوئے، پھر خواتین نے بیعت کی جو پردے کے اندر کپڑا پکڑوا کر لی گئی اور یوں الحمدللہ! بہت سے گھروں میں ذکر کی گونج اور اس کے انوارات پہنچے۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ رات '' ویدر گونس ،، قیام کیا جائے۔ یہ شریعت پور (سابقہ فرید پور) ضلع کی دوسری تحصیل ہے اور ہماری مجبوری یہ تھی کہ دوسری شام چٹا گانگ جانا تھا۔ سیٹ جہاز میں بک تھی اور وہاں سے ڈھاکہ جلدی پہنچا جا سکتا تھا جبکہ یہاں سے دیر ہونے کا امکان تھا۔ چنانچہ دس بارہ رکشوں کا قافلہ بنا۔ دو دو ساتھی ایک میں بیٹھے مگر میں تو اکیلا کافی تھا، دیر ہو چکی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور تنگ سا راستہ گھنے جنگل سے گزرتا تھا اور جگہ جگہ سیلاب اور گہرے نالے جن پر پتلے پتلے تختوں کے لٹکے ہوئے پل تھے۔ جن میں سے کئی تختے پہلے سے ٹوٹے ہوئے تھے، کسی کا پاؤں نیچے لٹکا ہوگا۔ اگر تختہ ٹوٹ جائے تو آدمی کے بچنے کا امکان کم تھا۔ چنانچہ ہر پل پر اُترنا پڑتا۔ پہلے سواری عبور کرتی اور رکشوں کے نیچے مٹی کے تیل کی بتیاں لٹک رہی تھیں جن کی شرمندہ شرمندہ روشنی میں ہم سب رسے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے

پل عبور کرتے اور تھوڑی دیر چلتے تو پھر وہی حال، عوامی لیگ کے ڈاکوؤں اور شیر دل کے شیروں کا خطرہ الگ اور درندوں کی ہیبت اپنی جگہ۔ جنگل کا خوفناک سناٹا، جس میں کبھی کبھی کوئی مینڈک ٹراتا تو پتا چلتا کہ کنارے کتنے اونچے ہیں، مگر رکشہ چلتا تو سارے خطرے بھول کر توجہ رکشہ کی طرف ہو جاتی کہ ابھی گرا کہ گرا۔ یوں گرتے پڑتے بہت دیر میں ہم ویدر گونس پہنچے۔ چار پائی نصیب ہوئی اور مچھر دانی میں اپنا کمبل اوڑھا۔ تھرمس سے قہوہ نکال کر پیا اور گولیاں کھا کر پڑ رہے کہ رات کے کھانے کا اب کیا سوال۔ علی الصبح ذکر اور نماز سے فارغ ہو کر چائے پی اور چل دیئے، پھر رکشہ۔ میں نے کہا: یار! رات والی سواری ہی کافی ہے، اب پیدل ہی چلیں گے۔ چنانچہ گھنٹہ بھر چل کر 7- بجے صبح ہم دریا کنارے پہنچے جہاں گھاٹ بنا ہوا تھا۔ ایک کشتی سامان لے کر روانہ ہو رہی تھی۔ ایک ہمارا انتظار کر رہی تھی، اور ایک سواریاں بٹھا رہی تھی۔ یہ 26- جنوری کی صبح تھی، ہم کمبل وغیرہ لپیٹ کر کشتی میں بیٹھے۔ یہ کھلی کشتی تھی جو ہمیں بڑے دریا تک موٹر بوٹ میں بٹھانے جائے گی۔ ساتھیوں کے مطابق ساڑھے تین میل فاصلہ تھا مگر پہنچنے میں ساڑھے تین گھنٹے لگ گئے۔ حالانکہ بہت اچھی رفتار سے جا رہی تھی۔ کنارِ دریا سورج نکل کر پانی میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ سورج کو جیسے پانی آئینہ دکھا رہا ہو، بہت خوبصورت منظر تھا جو کیمرہ نے قید کر لیا کہ کبھی کبھی اس خنک صبح اور سبک خرام کشتی کی یاد دلاتا رہے۔ کنارِ دریا اب لوگ آ جا رہے تھے۔ اکثر خواتین تھیں، کوئی پانی بھر رہی تھی، کوئی بال نچوڑ رہی تھی، دوسری دامن خشک کرنے میں لگی تھیں۔ بہر حال ہم بڑی دیر ٹھنڈی ہوا کھانے کے بعد موٹر بوٹ میں پہنچے جس میں ویسا ہی کیبن ہماری راہ دیکھ رہا تھا اور رات والی تھرمس جو ابھی چل رہی تھی، سے قہوہ انڈیلا اور کمبل میں دبک گئے۔ نزلہ، کھانسی اور تھکاوٹ نے بخار جیسا حال کر رکھا تھا۔ یوں ہم ڈھاکہ پہنچے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ راستے میں رکنا نہ پڑا اور ظہر ڈھاکہ آ کر پڑھی۔ مگر گھاٹ سے گھر تک پھر ہم اسی بے بی ٹیکسی کے سپرد تھے جس نے جی بھر کر لوریاں دیں۔ ہاں! ایک کام مزیدار ہوا کہ گھر پر سوپ مل گیا، جس کے تین چار کپ پی لیے۔ کھانا تو وہی الم غلم ہی تھا

جو اپنے بس کا نہ تھا، بس! پیاز اور ہری مرچ سے ایک آدھ پھلکا روٹی کا، وہ بھی یہ کوئی عجیب سے بناتے ہیں۔ کچھ دیر آرام کیا اور ایئر پورٹ کے لیے گاڑی میسر آ گئی۔ فاصلہ تو بہت زیادہ تھا مگر گاڑی میں آرام سے طے ہوا۔ مغرب وہاں ادا کی۔ کرنل محبوب صاحب تو اب مزید سفر کی تاب نہ رکھتے تھے، وہ ڈھاکہ میں رہے اور وہاں کا ساتھی میرے ساتھ ہولیا۔ ہم نے تو مغرب ایئر پورٹ پر ادا کی۔ پتا چلا جہاز گھنٹہ دیر سے جائے گا، تشریف رکھو۔ رکھنا ہی پڑی۔ ایک ساتھی چائے بنوا لایا۔ یہ ڈومیسٹک کے لیے الگ سے ایئر پورٹ بن رہا ہے۔ اسی کا ایک حصہ تھا جو بن چکا تھا۔ ٹکٹ بنوائے اور چیک اِن ہوئے، یہاں چیک اِن کی آزادی تھی۔ ہماری طرح یا دوسرے ممالک کی طرح سختی نہ تھی۔ شاید! یہاں جہاز اغواء کرنے کا رواج نہیں ہوا، جرم کرنا اور شور مچانا یہ تو ان لوگوں کا مشغلہ ہے، مگر یہاں چیک اِن کے بعد بھی لوگ باہر آ جا رہے تھے اور انہیں دوبارہ کوئی چیک بھی نہ کرتا تھا۔ ایک صاحب کویت سے آئے تھے اور چٹا گانگ جا رہے تھے۔ یہ خوشبودار لکڑی یعنی ''عود'' کے تاجر تھے۔ بنگلہ دیش سے لے جاتے اور کویت میں فروخت کرتے۔ انہیں کوئی بات کرنے والا ملا تو تفصیل سے باتیں کیں، اپنا کاروبار بتایا اور پھر سارا وقت مچھروں کی شکایت کرتے رہے، اور میں سوچتا رہا کہ یہ کھانے کی بات کیوں نہیں کرتا؟ اور پھر خیال آیا کہ حضرت تو اونچے ہوٹل میں مقیم ہوں گے، بھلا! انہیں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ جہاں شراب وشباب میسر ہوں، وہاں کسی مشرقِ وسطیٰ کے شیخ کو شکایت کس بات کی اور شراب کی ہر نسل تو ڈھاکہ ایئر پورٹ بار میں ڈیوٹی فری ملتی ہے۔ بہر حال عشاء بھی ادا کی مگر جہاز کی تاخیر کا گھنٹہ ختم نہ ہو پا رہا تھا۔ بندہ نے غسل خانہ تلاش کرنا چاہا۔ اندر نہ ملا تو ایک صاحب نما سیاہ فام جو چیک اِن پر مقرر تھے ان سے پوچھا: شکر ہے! وہ انگریزی جانتے تھے۔ انہوں نے ایک چپڑاسی ساتھ دیا جو بندہ کو ٹرمینل بلڈنگ ہی سے باہر لے گیا۔ وہاں باتھ روم تھے اور مزے کی بات یہ کہ واپسی پہ کسی نے چیک نہ کیا۔ خیر! جہاز میاں تشریف لائے اور ہمیں لے چلے۔ آدھ گھنٹے میں چٹا گانگ جا پٹخا۔ پٹخا اس لیے کہا ہے کہ جہاز فوکر تھا جو ہوا میں انسان کو نچاتا رہتا

ہے اور بڑے مزے سے زمین پر دے مارتا ہے، خود کو بھی اور مسافر کو بھی۔ مگر ظالم نے اتنا دیر سے پہنچایا کہ بیان سننے والے لوگ تو انتظار کر کے چلے گئے کہ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور سردیوں میں ساڑھے دس آدھی رات گزر جاتی ہے۔ خیر! ساتھی منتظر تھے ،گاڑی میں بیٹھے اور 20-25 میل دور شہر پہنچے، جہاں اپنا ٹھکانہ تھا۔ احباب کے ساتھ مل کر ذکر کیا اور یوں رات بارہ بجے کے قریب کھانے کی نوبت آئی جو خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ پتا چلا بڑا اسپیشل جھینگا پکا ہے۔ ہوگا سپیشل، مگر کھائے گا کون؟ دو ایک اشیاء میں چینی شامل تھی، وہ بھی نہ کھائی جا سکتی تھیں۔ لہٰذا اپنے لیے صرف سلاد ہی بچا اور چند نوالے روٹی، جو ہم روٹی جان کر کھاتے رہے ورنہ پتا نہیں کیسے بنی ہوئی تھی، اور آرام کیا۔ اگلی صبح 27- جنوری کی تھی۔ علی الصبح ذکر کے بعد ناشتہ منگوایا کہ اللہ کرے کچھ کھانے کو مل جائے، گوبھی کا ڈونگا دیکھا۔ خوشی ہوئی مگر پتا چلا اس میں چھوٹا جھینگا شامل ہے۔ آملیٹ اٹھایا اس میں بھی جھینگے فرائی تھے، خدایا یہ کیا! سب کیڑے مکوڑے ہی یہاں ملتے ہیں۔ اپنے لیے تو روٹی اور ہری مرچ ہی بچی، البتہ چائے پینے کو مل گئی۔ فریاد کی کہ بھائی! بنگال کا تو دال بھات مشہور تھا وہ تمہاری دال کیا ہوئی۔ کبھی وہ بھی کھلاتے ہم کو۔ کچھ دیر کے لیے باہر نکلے، ڈھاکہ والی خوشگوار معاشی تبدیلی یہاں نظر نہ آتی تھی، بالکل دو سال پہلے والا حال تھا۔ ہاں! اس چڑیا گھر کے پاس سے گزر ہوا تو میں مینا دیکھنے اندر گیا۔ شاید آپ کو یاد ہوگا پچھلے سفرنامے میں اس کا ذکر تھا کہ چونچ میں پھول لیے بیٹھی تھی۔ اللہ نے اس کی سن لی تھی، خود آزاد تو نہ ہو سکی تھی مگر ساتھی کو بندی خانے منگوا لیا تھا اور اب اکیلی اور اداس مینا کی بجائے ایک موٹی سی مسرور مینا ملی۔ تار پران کا جوڑا ایک دوسرے سے جڑا بیٹھا تھا، دُنیا و مافیہا سے بے خبر، کتنی عجیب بات ہے۔ اکیلی تھی تو سب سے بے خبر تھی، محبوب کو پالیا تو کسی کی خبر رکھنے کی ضرورت نہ رہی۔ اور اللہ کریم کے اپنے کام ہیں، اس کی فریاد سنی تو اس کا محبوب اسے ملا دیا، کاش! اس نے مانگا ہوتا کہ مجھے میرے محبوب سے ملا دے، تو وہ تو قادر تھا اسے آزاد کر دیتا۔ کملی مانگتی رہی کہ محبوب کو مجھ سے ملا دے اور یوں اسے بھی ساتھ قید کروا لیا۔

وہی چٹا گانگ ریلوے اسٹیشن اور گداگروں کے کنبے، وہی لاری اڈہ اور بھکاری۔ البتہ نئی مارکیٹ کسی حد تک روشن اور خوبصورت تھی، مگر بہت مہنگی۔ یوں پھرتے پھراتے ایک بج گیا اور ڈھائی بجے واپس ڈھاکہ کی فلائٹ تھی، اور ہمیں ڈیڑھ بجے ایئر پورٹ رپورٹ کرنا تھا۔ واپس گھر آئے تو واقعی دال روٹی پکی تھی۔ واہ ری قسمت! اگر پک ہی گئی تو اب کھانے کی فرصت نہ تھی۔ وضو کیا، دوگانہ ادا کیا اور ایئر پورٹ روانہ ہو گئے۔ اللہ کریم کا شکر ہے کہ واپسی کی چانس والی سیٹ کنفرم ہو گئی تھی، ورنہ چھ گھنٹے ریل میں خراب ہونا پڑتا۔ بہر حال جہاز بروقت روانہ ہوا اور ہم ساڑھے تین بجے ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ سے نکلے تو حسب معمول ٹیکسی رکشے والے لپکے۔ ایک نوجوان رکشہ قریب لایا مگر ہم ٹیکسی کار کی طرف بڑھ گئے تو وہ پہچان کر کہہ رہا تھا ''اپنا دشمن آہے'' کہ یہ تو دشمن ہے۔ یہ عوامی لیگ کا ذہن ہے اور کمیونسٹوں کا بھی کہ پاکستان کو دشمن اور ہندوستان کو دوست سمجھتے ہیں۔ ڈھاکہ میں آج ایک نئی جگہ ذکر اور قیام بھی تھا۔ حاجی سلیم صاحب ایک بہت بڑے کاروباری آدمی ہیں، ان کی گاڑی لینے آ گئی تھی۔ شام ان کے ہاں پہنچے۔ بہت سے احباب جمع تھے۔ سب نے مل کر ذکر کیا اور رات انہی کے ساتھ بسر ہوئی۔

28 جنوری 1992ء:

صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو حاجی صاحب کی گاڑی ہمیں اقامت گاہ پر چھوڑ گئی اور آج کئی دِنوں کے بعد غسل کرنے کی فرصت ملی۔ لباس تبدیل کر کے چل دیئے کہ ایک جگہ دار العرفان ڈھاکہ کا سنگ بنیاد رکھنا تھا۔ شہر سے ایک طرف کھلی جگہ پر ایک ساتھی نے زمین کا عطیہ دیا تھا۔ وہاں پہنچے اور عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، اللہ کریم اسے لوگوں کی دینی تعلیم اور قلبی تسکین کا ذریعہ بنائے۔ بنگال کے کھیتوں میں جانا بھی کوئی آسان کام نہیں، ہر طرف پانی اور درمیان میں پتلی سی پگڈنڈی جس پر پھسلن بہت زیادہ ہوتی ہے اور چلنا بہت دشوار۔ ساتھیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ہی گزرنا پڑا جو کیچڑ میں بے تکلف چل رہے تھے اور وہاں سے سیدھے ایئر پورٹ چلے گئے۔ فرسٹ کلاس کے لاؤنج میں ماحول نسبتاً بہتر تھا اور ایئر کنڈیشنڈ

کمرہ میں اگرچہ شراب کی بار سجی تھی مگر ٹھنڈے مشروبات اور چائے، کافی بھی تھی۔ کچھ دیر بعد تھائی ایئر کے جہاز میں بیٹھے ہم تھائی لینڈ کو اُڑے جا رہے تھے۔ یہاں یہ تجربہ ہوا کہ کم از کم فرسٹ کلاس تو پی۔ آئی۔ اے کی ان سے بہت بہتر ہے، حالانکہ پراپیگنڈہ ان کا بہت ہوتا ہے۔ اللہ کی شان! ہوائی جہازوں نے فاصلے سمیٹ دیئے ہیں۔ ہم صرف دو گھنٹوں میں بنکاک پہنچ گئے اور جہاز ایک خوبصورت رن وے پر اتر گیا۔ بنکاک ایئر پورٹ ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ یورپ کے کسی بھی ایئر پورٹ سے زیادہ خوبصورت ہے اور ہاں! تھائی لینڈ میں ویزہ کی سہولت ہوائی اڈے پہ موجود ہے۔ ہم جیسے ہی جہاز سے باہر آئے تو مقامی امیر صاحب اپنے صاحبزادے کے ہمراہ موجود تھے، جو تھائی ایئر میں ملازم ہے۔ ہم نے ویزہ کی درخواست کا فارم لیا اور بھر کر جمع کروا دیا۔ چند منٹوں میں انہوں نے ویزہ سٹیمپ کر دیا۔ باہر نکلے تو جوان ساتھی موجود تھے جن میں کچھ ملازمت کرتے ہیں اور کچھ یونیورسٹی کے طلبا تھے۔ باہر فیصل آباد کے عبدالجبار صاحب بھی موجود تھے جنہوں نے یہاں سے جاپان تک کا ساتھ دینا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے تو باہر بہت خوبصورت گاڑیاں، صاف ستھری سڑکیں اور ایک خوبصورت شہر ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے مغرب گھر پہنچ کر ادا کی۔ منصور صاحب کا خوبصورت دو منزلہ گھر کسی آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ لوگ جوتا تو برآمدے میں بھی لے کر نہیں جاتے، اور عموماً فرش اور اندر کی سیڑھیاں قیمتی لکڑی کی لگاتے ہیں جو پالش ہو کر بہت حسین لگتی ہیں۔ ہم نے نماز ادا کی، ذکر ہوا، سب احباب نے بیعت کی کہ ان سب کی پہلی ملاقات تھی اور کھانا کھا کر آرام کیا۔ بہت دِنوں بعد ڈھنگ کا کھانا اور ایک آرام دہ کمرہ نصیب ہوا۔ علی الصبح ذکر اور نماز کے بعد ناشتہ کیا جو باہر لان میں سجایا گیا تھا۔ یہ لوگ صحیح اسلامی روایات کے امین ہیں۔ کھانا نیچے دستر خوان بچھا کر اکٹھے کھاتے ہیں جس میں مردوں کے ساتھ باورچی اور ملازم بھی شریک طعام ہوتے ہیں اور خواتین الگ اندر کھاتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی نوکرانیاں شامل ہوتی ہیں۔ یہ 29 جنوری تھی۔

منصور صاحب نے شیخ الاسلام سے ملنے کا وقت لے رکھا تھا۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔

بہت بڑا گھر، جس کے باہر کا لان طرح طرح کے پرندوں کے پنجروں سے سجا تھا اور پھولوں بھرے لان میں ایک طرف گیراج تھا جس میں دوتین موٹریں کھڑی تھیں۔ ملاقات کا کمرہ چینی طرز کے خوبصورت بڑے گلدانوں سے سجا تھا۔ شیخ الاسلام تشریف لائے۔ عمر رسیدہ مگر بہت خوش طبع اور خوش اخلاق۔ انہوں نے پاکستان کے حالات کے بارے میں بہت زیادہ سوالات کیے اور اس بات پر بہت حیران تھے کہ پاکستان میں اسلامی قانون کیوں نافذ نہیں جبکہ ملک اسلامی اور حکومت بھی مسلمانوں کی ہے؟ پھر انہوں نے اپنا بتایا کہ یہاں چاروں صوبوں میں مسلمان آبادی ہے جن کے چاروں صوبائی شیخ ہیں۔ ان کا رابطہ ان سے رہتا ہے اور مذہبی کام باہمی مشورے اور شیخ الاسلام کے فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ ملک میں مسلمان دس فیصد ہیں۔ اگر کہیں چاند نظر آئے تو شیخ الاسلام کو اطلاع کی جاتی ہے جو متعلقہ شیخ کو تحقیق کا حکم دیتا ہے اور پوری تصدیق ہونے کے بعد عید یا رمضان وغیرہ کا اعلان کیا جاتا ہے، جس پر سب مسلمان مل کر عمل کرتے ہیں۔ حکومت چونکہ بدھوں کی ہے لہٰذا وہ اپنی صوابدید اور ضرورت کے مطابق قوانین بناتی ہے لیکن اگر کوئی قانون مسلمان کے مذہبی احکام یا قوانین کیخلاف ہو تو شیخ الاسلام مسلمانوں کا مؤقف اور اسلامی قانون پیش کرتے ہیں جس پر حکومت مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دے دیتی ہے، یا متبادل قانون انہیں دیتی ہے جو اسلامی احکام سے متصادم نہ ہو۔ اب تک وہ اکیس قوانین میں یہ تبدیلی کروا چکے ہیں۔ اب انہیں شکوہ تھا کہ لیبیا وغیرہ کچھ مسلمانوں کو فنڈ دے کر بھڑکا رہے ہیں اور حکومت سے لڑنے اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اللہ نہ کرے! کہ پھر ایک اور ملک سے برما اور فلپائن کی طرح مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں آنے لگیں۔ تاتاریوں کی یلغار کے مقابل خوارزم شاہ لڑتا رہا مگر خوارزم کی تباہی کے بعد، جو خود اس کے والد کی غلط پالیسی کا نتیجہ تھی جب اسے جنگ جاری رکھنے کو کہا گیا تو اس نے بہت خوبصورت بات کی تھی کہ میں مسلمانوں کو بار بار جمع کر کے موت کے حوالے نہیں کرنا چاہتا جبکہ پہلے ہی بہت مسلمان قتل ہو چکے ہیں۔ ہاں! مقابلے کی فوج ہوتی تو فتح کی اُمید پہ ضرور لڑتا، لیکن تھوڑے

تھوڑے لوگ بار بار قتل کراتے رہنا، نہ اسلام سے محبت کی دلیل ہے اور نہ مسلمانوں سے۔ کاش! یہ سیاسی اکھاڑوں کے شوقین اس بات کو سمجھ سکیں اور مسلمانوں کے مصائب میں اضافے کا سبب نہ بنیں۔ شیخ الاسلام نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شرکت کی دعوت دی اور کہا کہ میں باقاعدہ دعوتی کارڈ بھجوا دوں گا۔ یہ عید دوسرے روز منعقد ہو رہی تھی جس میں چاروں صوبوں سے مسلمان شرکت کر رہے تھے۔ پہلے تو بادشاہ اور ملکہ مہمانِ خصوصی ہوا کرتے تھے مگر اب ولی عہد یہ سارے کام نمٹاتا ہے۔ ہمیں بھی بہت شوق پیدا ہوا کہ ضرور دیکھا جائے کہ یہاں یہ کس طور مناتے ہیں۔ ان سے رخصت ہو کر ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور دیکھا۔ یہاں اشیاء دوبئی سے تین گنا مہنگی ہیں اور پاکستان سے بھی بہت مہنگی۔ سکہ تقریباً ایک ہی ہے، پاکستانی روپیہ اور تھائی بات تقریباً برابر ہیں۔ ہاں! کاریں بہت خوبصورت اور بہت سستی ہیں۔ غالباً حکومت کے ٹیکس زیادہ نہیں ہیں، بازار بہت خوبصورت اور بہت بھرے بھرے ہیں۔ لوگ ہنس مکھ اور ملنسار، تہذیب مغرب سے بھی ذرا آگے مگر سرعام کوئی بے حیائی نہ دیکھی، اور یوں ہم شانِ خدا دیکھتے ہوئے عصر کو پلٹے کہ شام کو ذاکرین جمع ہو جائیں گے۔ منصور صاحب لکھنے پڑھنے کا بہت کام کرتے ہیں۔ ''تعارف'' کا تھائی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں اور بھی چند کتابوں کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے، اب ''دلائل السلوک'' کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ یوں یہ دِن بھی بحمد للہ! ذکرِ الٰہی سے اختتام پذیر ہوا۔ کھانے میں پھل بہت عجیب تھے جو یہاں نہ دیکھے، اور ہاں! گھر کے صحن میں آموں کے درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ منصور بتانے لگے کہ ان پر سارا سال پھل آتا رہتا ہے۔ ایک پھل ختم ہو تو دوسرا پھل لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ آم بہت ہی میٹھا تھا۔ میں نے معذرت کر لی کہ نری شوگر ہی ہے اس میں، تو ان کی اہلیہ کچا آم توڑ لائیں اور کاٹ کر دے دیا جو بالکل کھٹا نہ تھا، ہلکا میٹھا تھا۔ آم کے ساتھ دوسرے پودے پہ خوبصورت لیموں لگے ہوئے تھے۔ منصور صاحب کا گھر بھی کم از کم چار کروڑ سے زائد کا ہوگا۔ یہ لوگ گھروں پہ بہت دولت صرف کرتے ہیں اور بہت ہی خوبصورت گھر بناتے ہیں۔

30 جنوری 1992ء:

ناشتہ کے بعد ہی گھر سے نکل پڑے کہ میزبان کی بیٹی کے ہاں دوپہر کا کھانا تھا اور پھر عید میلاد میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ اس کا گھر شہر کے ایک طرف گلبرگ آسا علاقے میں تھا۔ اگرچہ بنکاک کی سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ستھری ہیں اور آنے جانے کی الگ الگ، مگر پھر بھی گاڑیاں اس قدر ہیں کہ ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ شہر کے درمیان سے دریا گزرتا ہے جس پر متعدد خوبصورت پل بنے ہوئے ہیں۔ ایک خوبصورت مسجد دیکھی۔ مساجد شہر میں کئی ہیں مگر یہ بہت خوبصورت تھی۔ بدھوں کے خاص ہیئت کے مندر جا بجا تھے۔ ایک جگہ سکھوں کا گردوارہ بھی نظر پڑا۔ ہم جس گھر میں پہنچے وہ بہت بڑا گھر تھا اور کئی منزل کی خوبصورت عمارت۔ کھلا صحن جس میں خوبصورت پھول اور پھل دار پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ ہر پودے کے ساتھ مخصوص پرندوں کے پنجرے لٹک رہے تھے جن میں وہ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ یہ کاروباری حضرات کا گھر تھا اور شہر میں والد الگ، والدہ الگ دکان کرتی ہیں، اور ہر بیٹے کی الگ دکان ہے۔ یعنی سارا خاندان ہی کاروباری ہے۔ اور بہت اچھی بات ہے کہ دِن بھر سب لوگ کاروبار کرتے ہیں اور شام کو گھر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے رخصت ہو کر جلسہ گاہ کو چلے جہاں انہوں نے ہمیں تین بجے کا وقت دیا تھا اور ولی عہد سلطنت نے چار بجے پہنچنا تھا۔ ایک گھنٹے کا پروگرام ان کا تھا۔ ہم غالباً ساڑھے تین بجے پہنچے۔ ایک خوبصورت گیٹ کے اندر بہت ہی وسیع جگہ تھی۔ لان کے درمیان میں تالاب، جس کے عین درمیان خوبصورت فوارے، بائیں ہاتھ مختلف دکانیں جن میں ہر شے دستیاب، اور ساتھ میں فاسٹ فوڈ اور کولڈ ڈرنکس بھی۔ دائیں ہاتھ ایک بہت بڑا ہال جس میں نماز کا اہتمام بھی تھا اور سٹیج پر مقررین ٹیلیویژن پر تقریر کرنے والے تھے، جس کے سپیکر اس بڑے ہال میں لگے تھے جو تالاب کے اس پار تھا اور بہت ہی بڑا تھا۔ اس میں شاہی مہمان کے لیے سٹیج لگا ہوا تھا اور اس کے باہر ہر ملک کی اشیاء کی نمائش ان کے سفارتخانوں نے لگا رکھی تھی۔ ان دونوں ہالوں کے درمیان بھی شامیانے تھے جن

میں کھانے پینے کا اہتمام تھا اور ہر طرف بہت بڑے بڑے سکرین لگے تھے جہاں شاہی ہال کی ساری کارروائی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں بھی اندر لے جا کر سفارتکاروں کی قطاروں میں بٹھا دیا گیا۔ ہم تیسری قطار میں تھے مگر پیچھے کم و بیش ایک صد قطاریں کرسیوں کی تھیں جن کے درمیان سے راستہ تھا۔ سامنے شیخ الاسلام کی سیٹ تھی اور پھر سٹیج جس پر دونوں طرف درباری امراء کی سنہری کرسیاں لگی تھیں۔ درمیان میں شاہی کرسی جس کے دونوں طرف سنہری گلدانوں میں خوبصورت پھول سجے تھے۔ ساتھ سنہری میز جس پر پانی اور سگریٹ دان وغیرہ رکھا تھا اور کرسی کی پشت پر جرنیلوں کی سنہری کرسیاں تھیں، جن پر بحری، بری اور ہوائی افواج کے سالار براجمان تھے، جن کی وردیاں اور سنہری سٹارز خوب بہار دے رہے تھے۔ درباری خدام ایک ایک شے کو سلیقے سے سجا رہے تھے۔ سکیورٹی کا عملہ گلدانوں سے لے کر قالین تک چیک کر رہا تھا۔ ولی عہد عین چار بجے پہنچے اور سامنے سے ہال میں داخل ہوئے، جہاں کرسیوں کے درمیان استقبال کرنے والوں کی دو رویہ قطاریں تھیں۔ سارا ہال کھڑا ہو گیا۔ شہزادہ درمیان سے گزرتا ہوا سٹیج پر پہنچا تو ہر طرف کھڑے شاہی فوجی سلامی دے رہے تھے۔ پھر قومی ترانہ بجایا گیا اور جب ختم ہو گیا تو شہزادہ بیٹھ گیا۔ تب سارے ہال میں درود و سلام کے زمزمے سے گونج رہے تھے۔ پھر شیخ الاسلام اُٹھے اور پندرہ منٹ تقریر کی جو تھائی زبان میں تھی۔ جب وہ بیٹھے تو ولی عہد نے جوابی تقریر کھڑے ہو کر پڑھی، جو اُن کے کھڑے ہونے پر درباری خادم نے سنہری طشت میں رکھ کر پیش کی۔ اب مصیبت یہ کہ ولی عہد کھڑے ہیں تو سارا ہال کھڑا ہے۔ ان کی تقریر بھی تھائی زبان میں تھی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ صرف مسلمانوں ہی کے نبی نہ تھے، وہ تو انسانیت کے نبی تھے اور ہم سب ان کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا کوئی بھی مسلمان کرتا ہے۔ یوں تو ہر مذہب بنی آدم کو بہتر انسان بنانے کی سعی کرتا ہے مگر سب نے محدود پیمانے پر سعی کی جبکہ حضرت محمد ﷺ نے ساری انسانیت کو ایک خوبصورت انقلاب سے آشنا کر دیا۔ اور مسلمان ہمیشہ بہترین انسان بھی ہوتا ہے جس سے انسانیت اور ملک کو بھی ہمیشہ فائدہ پہنچتا

ہے۔ جب شہزادہ بیٹھا تو صلوٰۃ وسلام کا زمزمہ گونجا جس پر سارا ہال کھڑا ہو گیا تو شہزادہ کھڑا ہو گیا اور یہ صلوٰۃ وسلام کوئی آدھا گھنٹہ جاری رہا۔ بہت لطف آیا، سارا ہال بڑی مزیدار آواز میں لاؤڈ سپیکر کی لے سے لے ملا کر پڑھ رہا تھا۔ خاتمے پر دعا ہوئی اور شہزادے نے انعامات تقسیم کیے۔ تین کنیزیں ادب سے آکر شاہی نشست کے پاؤں میں بیٹھ گئیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ کوئی خادم یا کنیز کھڑے ہونے کی حالت میں نہ شاہ کے سامنے جاتا اور نہ پیچھے سے آتا بلکہ جھک کر جاتے اور قریب جا کر بیٹھ کر رینگتے ہوئے آگے بڑھتے۔ لاؤڈ سپیکر پر ایک ایک نام پکارا جاتا، وہ آدمی آگے بڑھتا، جھک کر آداب بجالاتا، کنیز انعام کا پیکٹ شہزادے کے ہاتھ میں تھماتی اور وہ آگے عطا کر دیتا۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو دربار بھی ختم ہو گیا اور ہم نے زندگی میں پہلی بار شاہی دربار کی جھلک دیکھی، جس میں سب سے زیادہ مجبور بادشاہ تھا جو اپنی ایک ایک حرکت پر پروٹوکول کا قیدی تھا۔ بہر حال ہم بھی باہر آئے، عصر ادا کی اور دل سے یہ دُعا نکلی کہ کاش! اپنے وطن میں بھی میلاد کی ایسی سنجیدہ اور پروقار اور شاندار تقریب دیکھنے کو ملے جس سے سڑکوں پر ہنگامہ، نہ ٹریفک بند، نہ دکانیں اور نہ ہی کوئی غیر شرعی حرکت، نہ غل غپاڑہ۔ سبحان اللہ! عظمتِ رسالت ایک ایک بات سے عیاں تھی۔ یہ حال ایک غیر مسلم ملک میں غیر مسلم حکومت کا دیکھا۔ جبکہ وطن عزیز میں وزراء سب سے آگے ہاروں کا بوجھ گردن پر ڈالے، ہلڑ بازی کو میلاد شریف کے نام پر ہوا دیتے نظر آتے ہیں۔ خیر! وہاں سے چلے تو گھر پہنچے۔ مغرب ہو گئی، احباب راہ دیکھ رہے تھے۔ بیان اور ذکر کی سعادت نصیب ہوئی۔ کھانا کھایا اور رات بارہ بجے تک ملاقات والوں سے واسطہ رہا، جبکہ دِن کو بھی آرام کا لمحہ میسر نہ آیا تھا مگر کیا کرتے حالات سنے تو سمجھ میں آیا کہ دُنیا کتنی مشکل جگہ ہے۔ کاش! ہمارے یہ مہربان علماء جو بات بات پہ فتویٰ تو صادر کرتے ہیں، متبادل اور درست راستہ دکھانے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے، وہ بھی ان حالات پر غور فرماتے۔ ابن حلاج نے سولی پر چڑھتے ہوئے کہا تھا کہ جو میں جانتا ہوں اگر وہ یہ لوگ جان لیتے تو مجھے سولی نہ دیتے، اور جو یہ نہیں جانتے اگر میں بھی نہ جانتا تو کبھی انا الحق نہ

کہتا۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ تھائی لینڈ کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مسلمان لڑکیوں کو جب بَر نہیں ملتا تو کافر لڑکوں سے شادی کرتی ہیں اور یوں اپنا دین دُنیا کی نظر کر دیتی ہیں۔ اب یہ حال ہندوستان میں بھی ہے۔ رات ایک خاتون سے ملاقات ہوئی جو عمر کا ایک لمبا حصہ گزارنے کے باوجود اسلام کو دل سے نہ بھلا سکی تھی اور اب ادھیڑ عمر میں یہ تمنا لیے پھرتی تھی کہ کاش! میرا خاوند مسلمان ہو جائے تو میں پھر سے اسلام کے دامن میں پناہ لوں۔ ہمارے پاس تو صرف اللہ کا نام ہی ہر مرض کی دوا ہے۔ اسے بھی ذکر سکھایا اور کہا خاوند کو بھی سکھاؤ کہ یہ ورزش صحت کی ضامن ہے۔ اللہ کرے! اسے دین اور عقیدے کی صحت بھی نصیب ہو۔ ایک جوڑے کا مسئلہ ان کی بیٹی تھی جو بنکاک ایئرپورٹ پر سعودی ایئرلائن میں ملازم ہے مگر اس کا بوائے فرینڈ ایک غیر مسلم ہے جس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ہماری ملاقات اس سے ہوائی اڈے پر بھی ہوئی تھی مگر جو کہانی اس کی ماں کے آنسوؤں نے سنائی، اس کا پیمانہ تھا۔ صبح اسے بلا بھیجا، اور کہا دوست کو بھی ساتھ لانا، اور یوں رات کے چند لمحے ہم نیند کی آغوش میں تھے، جس سے سحری کے ذکر کے لیے بیدار ہوئے۔ یہ مہینے کی آخری تاریخ یعنی 31 - جنوری تھی اور اپنا بنکاک میں آخری دِن۔ ناشتہ سے فارغ ہوئے تو وہ ملاقاتی آ گئے۔ اللہ کے نام کا امرت دھارا ہی انہیں بھی دیا۔ اس لڑکے کو بھی ذِکر سکھایا کہ اللہ کا نام تو لو، شاید اللہ کرے اگلے دورے تک اسلام قبول کر چکا ہو اور یوں یہ شادی خالص اسلامی ہو جائے۔ ورنہ تو ان عصمتوں کے اجڑنے کی ذِمّہ داری سب مسلمانوں پہ برابر ہے۔ یہاں قیام کا یہ آخری دِن سب دِنوں کی نسبت مصروف ترین دِن تھا۔ جوں جوں لوگوں کو خبر ہوئی کھچے چلے آ رہے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہم نے یہاں قیام کے لیے بہت کم وقت رکھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ بہت لوگ ملے، ذِکرِ الٰہی سیکھا اور بیعت ہوئے۔ یہ سلسلہ بھی رات بارہ بجے تک چلتا رہا، جبکہ رات اڑھائی بجے ہمیں جاپان کے لیے جہاز میں سوار ہونا تھا۔ لہٰذا رات بارہ بجے گھر سے نکلے اور ہوائی اڈے پر PIA کا فرسٹ کلاس لاؤنج انجوائے کیا، جو بند پڑا تھا۔ ذرا غور کیجیے! کہ یہ لوگ جو باہر ممالک میں کئی گنا زیادہ تنخواہ

پاتے ہیں، آرام سے سو رہے تھے اور لاؤنج کو تالا پڑا ہوا تھا۔ کیا خوب فرض شناسی ہے، کیا کر سکتے تھے؟ وہ چٹ جو بکنگ سے ملی خط کے ساتھ منسلک کر کے PIA کراچی کو بھیج دی کہ شاید کوئی جواب ہی طلب کر لیں۔ ان کا نہ سہی، ہمارا ہی سہی کہ میاں شکایت کیوں کرتے ہو۔ بہر حال جہاز اپنے وقت پر تھا جو عبدالجبار صاحب کے ہمراہ مجھے بھی لے اُڑا اور کرنل محبوب صاحب دوسرے روز واپسی کے لیے تیار تھے۔

یکم فروری 1992ء:

فروری کی پہلی تاریخ کا زرد زرد سورج ہم نے فلپائن میں منیلا کے ہوائی اڈے پہ اترتے ہوئے جہاز سے دیکھا۔ یہ وہی تاریخی ہوائی اڈہ ہے جہاں قتل ہونے والے اکینو کی موت نے اس کی بیوہ کو ملک کا سربراہ بنا دیا اور مارکوس کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مگر اب شاید پانسہ پلٹ جائے کہ مارکوس نے وطن سے دور جان دے کر اپنی بیوہ کے لیے عوام کی ہمدردی کا پتا پھینکا ہے۔ کنارِ سمندر بہت خوبصورت جگہ تھی مگر باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی، جہاز بھی تھوڑی ہی دیر رکا اور ٹوکیو کے لیے اُڑ گیا۔ منیلا سے اُڑنے والا جہاز سمندر پر پرواز شروع کرتا ہے اور جیسے ہی سمندر ختم ہو ٹوکیو کا ہوائی اڈہ آ جاتا ہے۔ یہ پانچ گھنٹے سمندر کے اوپر اُڑتا رہتا ہے۔ ٹوکیو پہنچے تو باہر دیکھنے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں سردی ہے۔ سارا علاقہ برف کی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا حتیٰ کہ سمندر کے کنارے سارا بیچ بھی برف پوش تھا۔ میرا یہ سردی کا سفر برطانیہ سے شروع ہوا، جہاں سردی کی پہلی برف باری ہو چکی تھی اور دِن کو درجہ حرارت پانچ سات رہتا تھا۔ پھر گھر پہنچا تو درجہ حرارت تقریباً وہی تھا، جب کراچی پہنچے تو گرمی تھی اور موٹے کپڑے بوجھ بن گئے۔ ڈھاکہ پہنچے تو گرمی مزید بڑھ گئی ساتھ مچھروں کا تحفہ بھی، بنکاک کا موسم بھی ڈھاکہ سے مختلف نہ تھا مگر شہر صاف ستھرا اور مکھی مچھر سے پاک تھا۔ نیز کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا لہٰذا بات بنی رہی، اور جب یہاں اعلان ہوا کہ دوپہر بارہ بج رہے ہیں اور درجہ حرارت دو ڈگری سینٹی گریڈ ہے تو بہت خوشی ہوئی۔ باہر ہر طرف برف ہی برف تھی حتیٰ کہ کھڑے ہوئے ہوائی جہازوں کے پَر سے ایک مشین پانی مار

کر برف ہٹا رہی تھی۔ ہم امیگریشن پر پہنچے تو انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو مسلسل آ رہا تھا یعنی آنے والے جہاز انسانوں کو اگل اگل کر ادھر پھینک رہے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر اندر پہنچے تو بے پناہ ہجوم تھا۔ آدمی جس طرف بھی گزرتا، انسانوں کا سمندر چیر کر گزرنا پڑتا مگر کمال ہے، کوئی شور نہ تھا۔ ہر کوئی اپنے کام میں مصروف تھا۔ مگر یہ سارا رش آنے جانے والوں کا تھا۔ باہر نکلے تو ریسپشن پہ کوئی نہ تھا۔ وہاں سے بھی مسافر آ جا رہے تھے۔ بڑی حیرت ہوئی! اپنے تین ساتھی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم ان کے ساتھ ہو لیے اور برف پوش راستوں سے گزرتے ہوئے گھنٹہ بھر کی ڈرائیونگ کے بعد سکوبا سائنس سٹی پہنچ گئے اور گھر پہنچ کر مغرب ادا کی۔ احباب کو ذکر کرایا اور بروقت آرام کو لیٹ رہا کہ جاگے ہوئے چوالیس گھنٹے بیت چکے تھے۔ 31 جنوری کی صبح 3 بجے سے لے کر آج یکم فروری کی عشاء ہو رہی تھی، اور آرام کا کوئی لمحہ میسر نہ آیا تھا۔ جاپان دُنیا کا مصروف ترین ملک ہے، جہاں انسان نہیں شاید روبوٹ بستے ہیں۔ علی الصبح اٹھ کر کام پر جانا اور رات آٹھ بجے تک کام ہی کرتے رہنا، یہ یہاں کی عام زندگی ہے۔ لوگ اس قدر مصروف ہیں کہ آنے جانے اور ملنے ملانے کا تصور نہیں۔ مجھے سکوبا (Scuba)، تھائی ساما، ناریٹا، ٹوکیو اور یوکوہاما جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ لوگوں کو مسلسل مصروف پایا۔ اوسطاً بارہ گھنٹے روزانہ کام تو کوئی عجیب بات نہیں۔ مذہب ہے بھی، اور نہیں بھی۔ ایسے کہ ان کا عقیدہ کچھ روحوں سے زیادہ ہے۔ پہاڑ، دریا، درخت، سورج، چاند، ہر شے مقدس ہے کہ سب میں خالق کی روح موجود ہے۔ ان کے مطابق بادشاہ کو بھی اللہ کی روح نے فیوجی کے مقدس پہاڑ پر جنم دیا، اور جاپان کے بے شمار چھوٹے جزیرے اسی روح کے انڈے ہیں وغیرہ۔ اپنا معبد لکڑی کی عمارت سی بنا کر اس کے اندر کئی چوبی عمارتیں، ایک دوسرے کے پیٹ میں بناتے چلے جاتے ہیں اور عجیب وغریب بت رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ باہر ایک بڑا گھنگھرو لٹک رہا ہوتا ہے جس کے ساتھ موٹا سا رسا ہوتا ہے، جسے کھینچنے سے گھنگھرو بجتا ہے اور خدا کو بیدار کرتا ہے جو عموماً سویا رہتا ہے۔ اور مذہب نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان کی عملی زندگی میں کسی حلال و

حرام، یا جائز و نا جائز کی کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ اکثریت اوہام کا شکار رہتی ہے اور کام کرنے، یا نہ کرنے کے لیے معبد میں "ہاں" لینے آتے ہیں، جس کی ہاں ناں پر عمل بھی کرتے ہیں۔ یا پھر مرنے والوں کو بجلی کی بھٹی میں جلا کر مشتِ غبار کو معبد میں کسی بھی پتھر کے نیچے دبا دیتے ہیں۔ امراء اپنی زمین پر مدفن بنا لیتے ہیں اور وہ بھی ایک چبوترہ سا، جس پر ایک مینار سا بناتے ہیں اور سارے خاندان کی راکھ اس میں دباتے چلے جاتے ہیں۔ ہر مرنے والے کی تختی لمبی سی لکڑی پر لکھ کر اس مینار کے ساتھ کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جنس آزاد ہے مگر یورپ و امریکہ کی طرح سرِ عام کوئی بے حیائی نہیں۔ لوگ ذرا باوقار طریقے سے رہتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی انگلی اٹھائے۔ ہاں کوئی نوجوان لڑکا لڑکی چاہیں تو والدین ایک کپ چائے پر رخصت کر دیتے ہیں۔ مشکل ترین بات یہ ہے کہ لڑکی انگوٹھی کی ڈیمانڈ کرتی ہے جو ہمارے ہاں حق مہر کی مانند ہے۔ وہ کئی لاکھ ین کی ہوتی ہے جسے خریدنے کے لیے پہلے کئی فارم بھرنا پڑتے ہیں کہ آمدن کتنی ہے؟ بچت کیسے کی؟ انکم ٹیکس دیا ہے یا نہیں؟ تب خریدنے کی اجازت ملتی ہے۔ اگر خاتون چاہے تو سستی سی انگوٹھی پہ بات بن جاتی ہے۔ گھر کی مالکہ خاتون ہوتی ہے، مرد پیسہ لا کر اسے دیتا ہے اور پھر سگریٹ بیڑی کے لیے مانگ کر لیتا ہے۔ اولاد بہت کم، ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بچے، اور اب تو بچے پیدا نہ کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ اشیائے ضرورت کی بے پناہ مہنگائی ہے اور لوگ بچے کی ضروریات، سکول اور علاج وغیرہ برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ساری دُنیا سے الٹ، حکومت جاپان کی پریشانی یہ ہے کہ لوگ بچے پیدا کریں۔ مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ ایک وقت کی سبزی دال کے لیے ایک اوسط خاندان کو قریباً دس ہزار ین (Yen) چاہئیں۔ لوگوں کی اجرتیں بہت زیادہ ہیں، عموماً کام فی گھنٹہ کے حساب سے ہوتا ہے، اور دو ہزار ین فی گھنٹہ مزدوری کے ساتھ لوگ کم از کم بارہ گھنٹے بعض اوقات زیادہ وقت لگاتے ہیں۔ پھر کم و بیش سال بھر سے آدھی اجرت بونس میں پاتے ہیں۔ اس کے باوجود گھر بنانے کی سکت نہیں رکھتے، اور ایک جاپانی عمر بھر اپنے گھر کا خواب دیکھا کرتا

ہے۔ کمروں کی پیمائش ٹاٹامی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ٹاٹامی اڑھائی ضرب پانچ فٹ کی موٹی چٹائی ہوتی ہے جو فرش پر بچھی ہوتی ہے۔ اسی پر سوتے ہیں۔ ایک لحاف نما گدہ بچھا لیتے ہیں جسے فتان کہتے ہیں۔ عموماً چار ٹاٹامی کا کمرہ چالیس ہزار ین ماہانہ کرایہ پر ملتا ہے جبکہ باتھ کے لیے بازار میں پبلک باتھ جانا پڑتا ہے۔ اگر ساتھ چھوٹا سا باتھ روم بھی ہو تو کرایہ ساٹھ ہزار ین ماہانہ ہو جاتا ہے۔ لوگ جو بازار وغیرہ میں کام کرتے ہیں، وہ بلڈنگز میں سنگل کمرے کا فلیٹ لے کر دفتر بنا لیتے ہیں۔ اس میں چھوٹا سا باتھ اور ایک طرف چولہا، درمیان میں راہ داری سی اور آگے چھوٹا سا کمرہ جو دکان اور دفتر دونوں کا کام دیتا ہے۔ رات کو میز کرسی کی جگہ بستر بچھایا اور گھر بن گیا۔ ایسے کمروں کا بھی ایک لاکھ ین ماہانہ کرایہ ہوتا ہے۔ یوکوہاما میں ایک دوست کا گھر کسی حد تک معقول تھا۔ دو چھوٹے بیڈ رومز، ایک باتھ روم، چھوٹا سا کچن، اور ڈرائنگ روم۔ اس کا کرایہ اڑھائی لاکھ ین ماہانہ تھا جبکہ دو کاریں پارک کرنے کا کرایہ الگ۔ اس طرح کوئی تین لاکھ ین تو ماہانہ کرایہ ہی ہو جاتا ہے۔ اور ہوٹل پہ تو جان نکلتی ہے۔ یوکوہاما میں ایک ہندوستانی کا ہوٹل تھا۔ ایک بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ مشہور یہ تھا کہ یہ سب سے سستا ہے۔ ہم پانچ آدمی تھے مچھلی کے تکے منگوائے اور تنور کی چند روٹیاں جو جاپان میں نعمت غیر مترکہ سے کم نہ تھیں، اور ایک ایک کپ چائے یا کافی بھی۔ بل دیا پچیس ہزار ین۔ شاباشے وئی! حد ہو گئی! یوکوہاما میں ایک مکان فروخت ہوا جو اندازاً تین مرلے پر تھا۔ نیچے باتھ، ڈرائنگ روم اور کچن اوپر دو بیڈ روم، چار کروڑ ین۔ یہی حال جوتے کپڑے اور دیگر تمام ضروریاتِ زندگی کا ہے، جس نے جاپانی قوم کو روبوٹ بنا دیا ہے اور کام، کام اور بس کام، یہ انہی کا کام ہے۔ کار کی سواری پہ خرچ کم آتا ہے۔ آپ ریل پر بیٹھیں گے تو دوگنا، اور بس میں سوار ہوں تو خرچ چار گنا آتا ہے۔ ہاں! ریلیں اور بسیں آرام دہ اور خوبصورت اور وقت کی پابند ہیں۔ ریل تین طرح کی ہے، سب وے جو شہر کے اندر چلتی ہے۔ اس کے پلیٹ فارموں پر تیر کے نشان لگے ہیں، وہیں ڈبے کا دروازہ آئے گا۔ سوار ہونے والے وہاں کھڑے ہیں۔ اترنے والے ڈبے کے اندر دروازے پر آ جاتے ہیں۔ جیسے ہی گاڑی رکی،

دروازہ کھلا، اندر والے باہر اور باہر والے اندر، نہ شور نہ جھگڑا اور دس سیکنڈ بعد گاڑی چل دی۔ اس طرح ساڑھے پینسٹھ منٹ میں ٹوکیو شہر کا چکر پورا کر لیتی تھی۔ اب انہوں نے انجن وغیرہ نئے ڈالے، پٹڑی مرمت کی اور گاڑی باسٹھ منٹ میں پہنچنے لگی تو شہر بھر میں جشن کا سماں تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں ہر سٹیشن پر کہ ساڑھے تین منٹ کی بچت ہو گئی۔ جاپانی جھنڈیاں لگانے اور رنگ برنگے پھولوں کے بہت شائق ہیں۔ دوسری گاڑی ذرا تیز گام قسم کی ہے، جو کسی جگہ تو درمیان میں پٹڑی اور دائیں بائیں ریل نیچے تک گئی ہوتی ہے۔ بجلی پٹڑی سے ہی مہیا کی جاتی ہے، خوبصورت اور تیز رفتار، اور کبھی پٹڑی چھت پر اور تیز گام لٹکتی ہوئی جاتی ہے۔ یہ دو اقسام ہیں۔ کہیں سڑک سے نیچے، اور کہیں سڑک نیچے اور ریل اوپر۔ تیسری قسم جو سب سے تیز سواری ہے، وہ بلٹ ٹرین ہے جو دو سو پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ سڑکیں خوبصورت اور صاف ستھری۔ مین ہائی وے ٹوکیو شہر کے اوپر سے گزر جاتی ہے بلکہ پورے ملک میں ہی ہائی وے تقریباً پل کی طرح سے ہیں، کہیں کہیں زیر زمین چلی جاتی ہے۔ اگر زمین بلند ہو تو نیچے سے گزر گئی ہوتی ہے۔ یہاں میں نے ایک نئی شے جو دیکھی وہ ساؤنڈ ایبز اربرز (Sound Absorbers) تھے۔ ہائی وے کے دونوں طرف آٹھ دس فٹ بلند جالیاں سی لگی ہیں جن کے باہر گاڑیوں کا شور نہیں جاتا۔ جہاں آبادی ہے، وہاں یہ میلوں تک دونوں طرف لگی ہیں۔ جاپانی صاف ستھرے، کم گو اور نفاست پسند ہیں۔ جھگڑے کا کوئی تصور نہیں، اور نہ کسی کو فرصت ہے۔ ایک ساتھی بتا رہے تھے کہ مجھے یہاں دو سال ہوئے ہیں، کبھی کسی جاپانی کو لڑتے نہیں دیکھا۔ شاید وہاں نہ محبت کی فرصت ہے، نہ نفرت کی۔ اور بارہ چودہ گھنٹے کام کر کے آنے جانے کا وقت بھی لگائیں تو ملنے ملانے کا، یا محبت و نفرت کے لیے کسی کے پاس وقت ہی کب بچتا ہے۔ لہٰذا مہمان کا بھی کوئی تصور نہیں، آپ کسی دروازے پر دستک دیں تو تھوڑا سا کھول کر وجہ پوچھیں گے اور بند کر دیں گے۔ اندر آنے کا کوئی نہیں کہتا، جوانی تو محنت مزدوری میں نکل جاتی ہے، مگر جب بندہ ریٹائر ہوتا ہے تو پنشن پہ گزر مشکل۔ لہٰذا بیویاں طلاق حاصل کر کے جائیداد

اور جمع پونجی پر قبضہ کر لیتی ہیں کہ جائیداد انہیں آدھی مل جاتی ہے اور پونجی اگر کوئی ہو تو پہلے ہی ان کے پاس ہوتی ہے، لہٰذا بابے سے جان چھڑاتی ہیں۔ اسی لیے بوڑھوں میں طلاق کی شرح بہت زیادہ ہے۔ میں سکوبا (Scuba) سائنس سٹی میں ٹھہرا تھا۔ وہاں ڈاکٹر مطیع اللہ صاحب کے پاس سرکاری مکان کافی بڑا تھا جو وہاں کسی تحقیقی کام میں مصروف تھے۔ سکوبا (Scuba) ایک پہاڑ ہے جو مقدس بھی ہے۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں حکومتِ جاپان نے وہاں گاؤں کی جگہ ایک خوبصورت نیا شہر بسایا ہے جس میں سائنسی تحقیقات کے تقریباً سبھی ادارے منتقل کر دیئے ہیں اور اسے سکوبا (Scuba) سائنس سٹی کا نام دیا ہے۔ بہت خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہے۔ مجھے سکوبا (Scuba) یونیورسٹی میں طلباء کے ایک گروپ سے ملاقات اور بیان کا موقع نصیب ہوا جو انڈونیشیا اور ملائشیا کے مسلمان تھے اور وہاں "Ph.D" کر رہے تھے۔ ضرورتِ ذکر پر بات ہوئی اور بحمد اللہ! سب نے بات کو سمجھا اور ذکر شروع کر دیا۔ ایک روز ٹوکیو یونیورسٹی میں بات کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ پہلے ہم ٹوکیو شہر میں ایک دوست کے دکان گھر نما فلیٹ میں رکے، مغرب وہاں پڑھی۔ یہ جگہ سن شائن بلڈنگ کے پہلو میں تھی جو چونسٹھ منزلہ خوبصورت اور ٹوکیو کی بلند ترین عمارت ہے۔ ذرا فاصلے پر ٹوکیو ٹاور کی جگمگ کرتی روشنیاں نظر آتی ہیں۔ یہ بھی تقریباً تریسٹھ میٹر بلند ہے اور پیرس کے ٹاور کی طرح بنا ہے۔ ایک لفٹ نصف پر لے جا کر چھوڑ دیتی ہے اور دوسری اوپر لے جاتی ہے۔ یہاں کے اکثر پہاڑ آتش فشاں ہیں جو کبھی کبھار آگ اور لاوہ اگلنے لگتے ہیں۔ نیز زلزلے اکثر آتے ہیں۔ ایک روز علی الصبح زلزلہ آیا جو ریکٹر سکیل پر پانچ تھا مگر لوگ پروا نہیں کرتے۔ عمارات بہت عجیب بناتے ہیں۔ مضبوط بنیاد ڈال کر اوپر گارڈر کھڑے کر کے کمرے بناتے ہیں اور چھت اور دیواریں لکڑی سے بنا لیتے ہیں۔ سب کام مشینیں کر دیتی ہیں۔ سن شائن بلڈنگ کی آٹھ درجہ تک کے زلزلہ کی گارنٹی ہے، حالانکہ اگر چھ درجہ ہو تو شہروں کو کھنڈر بنا دیتا ہے۔ یہ تو گارنٹی ہے، ممکن ہے دس تک برداشت کر جائے۔ ہم وہاں سے نکلے تو یونیورسٹی جانا تھا، اور وہ دوست گزشتہ بیس سالوں سے وہاں اپنا

کاروبار کر رہا تھا مگر اسے یونیورسٹی کا راستہ معلوم نہ تھا۔ بہر حال اندازے پر چلتا رہا اور کوئی آدھا گھنٹہ گھوم پھر کر آخر ایک چوک میں رک گیا کہ جناب اب پتا کرنا چاہیے چنانچہ وہ ساتھ کی پولیس پوسٹ پر گیا۔ مگر انہوں نے بھی معذوری ظاہر کی تو پھر ہم پولیس اسٹیشن گئے، جس کے قریب سب وے (Sub-Way) یعنی شہر میں چلنے والی ریل کا اسٹیشن بھی تھا۔ پہلے تھانے والوں سے بات ہوئی کہ ٹوکیو یونیورسٹی کا راستہ بتائیے۔ انہوں نے بڑے آرام سے بتایا کہ جناب ہمارے تھانے کی حدود میں نہیں ہے۔ گویا ان کا سارا علم اپنے تھانے تک تھا۔ شاید وہ ساری نوکری اسی تھانے میں گزارتے ہوں گے۔ ہم وہاں سے نکل کر سب وے (Subway) اسٹیشن پر گئے۔ سخت بھیڑ تھی اور جوان جوڑے تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک پاکستانی صاحب نے دیکھا تو رک گئے۔ پوچھا کہ آپ فلاں آدمی ہیں؟ بھلا آپ کو کیسے پتا ہے؟ تو کہنے لگے: میں آپ کی ملاقات کا منتظر تھا اور یونیورسٹی کو جا رہا تھا کہ نظر پڑی تو سمجھ گیا کہ یہ وہی ہو سکتے ہیں۔ یہ حضرت بھی گزشتہ پچیس برس سے وہاں مقیم ہیں۔ کبھی اسی ٹوکیو یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، پھر یہاں شادی کر لی۔ صاحبِ اولاد ہیں اور ریڈیو جاپان پر اردو سروس میں بھی کام کرتے ہیں، بلکہ پروگرام کرتے ہیں۔ یہ نہ سوچیں کہ وہ تو وہاں کے شہری ہوں گے۔ نہیں جناب! ایسے لوگوں کو بھی شہریت نہیں دی جاتی، بلکہ بیوی کی سفارش پر ایک سال کے لیے ویزہ ملتا ہے اور ہر سال ملتا ہے۔ لہٰذا بیوی کے مزاج کی بات ہے، اگر سفارش نہ کرے تو فوراً ڈی پورٹ (Deport) کر دیئے جائیں گے۔ لہٰذا بڑے دبک کر جیتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ اب تک یونیورسٹی کا راستہ وہ بھی بھول چکے تھے۔ آخر کیوں؟ جناب اس لیے کہ جاپان کی مصروفیات میں کسی کو اپنے کام اور مقررہ راستے کے علاوہ جاننے کی فرصت نہیں، اور وہ خود سب وے سٹیشن سے یونیورسٹی کا سٹیشن پوچھ کر سوار ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ طے ہوا کہ یونیورسٹی فون کیا جائے۔ میزبان ہمیں راستہ بتا دیں گے۔ فون کیا تو پتا چلا ہم یونیورسٹی کے بہت قریب کھڑے ہیں۔ چنانچہ میزبان ہمیں لینے آ رہے ہیں، کمال ہو گیا بھئی! یہ سب لوگ اس قدر

بے خبر ہیں، بلکہ یوں کہیے اپنے کام سے کام رکھنے والے ہیں۔ چند منٹ وہاں کھڑے اس ہجوم کو دیکھا کہ میں سمجھا یہ کالج کے سٹوڈنٹ ہیں، مگران صاحب نے بتایا کہ سب لوگ کام کرتے ہیں۔ اب رات کے آٹھ بج رہے ہیں، انہیں چھٹی ہوئی تو یہ اسٹیشن کے قریب فاسٹ فوڈ کی دکانیں ہیں، وہاں سے کھاتے اور گپ شپ کرتے گاڑی میں بھاگے جارہے ہیں۔ گھر پہنچتے اور بستر پر جاتے گیارہ بج جائیں گے۔ علی الصبح سات بجے یہاں پہنچنے کے لیے پانچ بجے اٹھیں گے اور ناشتہ اسی جگہ ہوگا۔ ایسے ہی رات کی شفٹ والوں کے آنے کا رش ہے۔ یہ ہجومِ عاشقاں نہیں کہ آپ انجوائے کریں۔ یہاں تو عشق بھی چلتے پھرتے ہی ہو سکتا ہے۔ ہجر ہے یا وصال، بات چلتے چلتے ہوگی۔ ہمارے وہ دوست فوراً آ گئے۔ خوبصورت ڈاڑھی، فارغ التحصیل عالم "M.A." کوالیفائیڈ اور یہاں "Ph.D" کر رہے ہیں۔ پشاور سے تعلق ہے، مل کر لطف آ گیا۔ اللہ سب علماء کو یہ دولت عطا کرے اور مسجد میں صرف عبادت ہی نہ کیا کریں، ذرا فیلڈ میں کام کر کے بھی دکھائیں۔ انہوں نے کھانے کا اہتمام بھی روایتی پشاوری انداز میں کر رکھا تھا۔ کچھ طلباء تھے جو انڈونیشیا اور ملائشیا کے تھے، کچھ ڈاکٹر صاحبان اور چند افسر جو پاکستانی تھے۔ پہلے بیان ہوا جو مجبوراً انگریزی میں کرنا پڑا، پھر عشاء اور کھانا اور واپس ٹرین سے روانہ ہو کر رات بارہ بجے سکوبا (Scuba) پہنچے۔ سٹیشن ہو یا سڑک، مشین میں سے کولڈ ڈرنک، شراب، گرم کافی اور چائے بھی مل جاتی ہے۔ قیمت ڈالیں بٹن دبائیں اور ٹھک سے بوتل یا ڈبہ باہر، تو یوں سفر میں سہولت بہت ہے۔ گاڑی آرام دہ اور سبک رفتار، مگر لوگ بیچارے چپ چاپ تھے۔ تھکے ہارے، نیم خوابیدہ اور صبح کی فکر میں، آپ سے کیا بات کریں گے۔ اگلے روز ہمیں سائی تھاما جانا تھا۔ وہاں اپنے ان بھائیوں سے ملاقات، بیان اور حالات دیکھنے کا اتفاق ہوا جو یہاں سے مزدوری یا کام کے لیے جاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں ملتی، چونکہ سب غیر قانونی طور پر رہتے ہیں لہٰذا مزدوری نصف ملتی ہے یعنی ہزار ین گھنٹہ اور بونس بھی نہیں۔ رہنے کو گتے اور ٹین کا ڈبہ سا کارخانہ دار دے دیتا ہے اور کام کے وقت پیک کھانا

بھی، مگر اجرت کم دے کر رقم زیادہ نکال لیتا ہے، بظاہر مفت دیتا ہے۔ لوگ رات دس بجے کے قریب پہنچنا شروع ہوئے۔ تب تک جو چند قابو آئے، ہم انہیں نہ صرف تقریر سنا چکے تھے بلکہ ذکر بھی کرا چکے تھے اور عشاء پڑھ کر کھانا بھی کھا چکے تھے۔ کھانے میں بہت لطف آیا۔ میں نے انہیں دال پکانے کو کہا تھا، وہ بھی مل گئی اور چپاتی بھی، مگر گوشت بھی بہت مزیدار پکا تھا، مرغ بھی اور بکرے کا بھی۔ بھلا پٹھان کب گوشت سے چوکتے، ٹوکیو والے مولوی صاحب بھی ساتھ تھے۔ ویسے ہی انہوں نے پوچھ لیا، یار! یہ گوشت حلال ہے؟ جی! بلاشبہ حلال ہے۔ پھر کیا تھا، خوب کھایا۔ جب کھانا ختم ہونے کو تھا، تب تک ان سے طے کر چکے تھے کہ یہ مجھے بھی پہنچایا کرو۔ تو میں نے پوچھ لیا کہ کیسے حلال ہے؟ آپ کو پتا ہے؟ جی! کیوں نہیں، جس ملک سے آتا ہے وہاں جو مشینیں جانور کاٹتی ہیں اس کے بلیڈ پر اللہ اکبر لکھا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے تو سر پیٹ لیا، ظالمو! پہلے کیوں نہیں بتایا۔ بڑی مشکل سے جھگڑا کرنے سے انہیں روکا۔ بہرحال یہ وہاں کی عام زندگی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ خود ذبح کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ ہم وہاں سے بہت دیر سے پلٹے۔ سکوبا سائنس لیبارٹری گئے تو جو آدمی کار پارک اور برآمدے کے درمیان برف ہٹا رہا تھا، وہ لیبارٹری کا چیف تھا یعنی یہاں کام کرنا عزت شمار ہوتا ہے، اور دوسری عجیب بات کہ جوان آدمی تھا۔ پتا چلا کہ یہاں چیف محض سینئرز کو نہیں بلکہ قابل اور جسمانی اعتبار سے فٹ آدمی کو بنایا جاتا ہے۔ سارے عالم سے ان کے بہت سے انداز جداگانہ ہیں، مثلاً جو چیز ملک کے اندر استعمال ہوتی ہے وہ کار ہو یا کمبل، وہ کبھی ایکسپورٹ نہ ہو سکے گی، اور دوسرے وہ سب سے اعلیٰ ہو گی۔ ہمارے یہاں ایکسپورٹ کوالٹی اول درجہ کی ہوتی ہے مگر وہاں ڈومیسٹک یوز (Domestic Use) کے لیے بہترین کوالٹی، نمبر دو مغربی ممالک کے لیے اور تیسرے درجے کی شئے تیسرے درجے کے ملکوں کے لیے بنتی ہے۔ ریٹ تو بہت زیادہ ہیں مگر اشیاء بہت اعلیٰ حتیٰ کہ جو کمبل وہ خود استعمال کرتے ہیں، دُنیا میں کہیں نہیں ملتا اور بہت خوبصورت بھی ہے۔

جو چند شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا، سب بہت خوبصورت اور صاف ستھرے، دکانیں بجی ہوئی، اور جوان جوڑے ہر طرف گھومتے نظر آتے ہیں۔کام پر آتے ہوئے، کہیں جاتے ہوئے، خریداری کرتے ہوئے مگر مغرب کی طرح کوئی بے حیائی نہیں کرتا، نہ چوری، نہ جھگڑا اور نہ فراڈ۔ یہ سب کچھ مغرب کو ہی نصیب ہے۔جگہ کی قلت کا حال یہ ہے کہ پرانی کار پھینکنے کے لیے جگہ نہیں ملتی اور یوں یہ کاروبار کرنے والے پندرہ ہزار ین لے کر، کار بھی لیتے ہیں اور پھر اسے سکریپ بنا کر بیچ دیتے ہیں۔اگر ایک ٹائر پھینکنا ہو تو دوصد ین ساتھ دیں۔ ہاں! آپ کی اگر اپنی زمین ہے تو کچھ عرصہ وہاں کار کھڑی رکھ سکتے ہیں اور زمین بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔جن کے پاس ہے، وہ سال میں کم وبیش چار فصل لیتے ہیں۔ٹریکٹر کے پیچھے مختلف آلات لگا کر سب کام مشین سے کرتے ہیں۔باغ بھی جدید طرز پر ہیں، درختوں کی ہر زائد شاخ کاٹ دی جاتی ہے اور پھل آئیں تو سارے باغ پر جال تنا ہوتا ہے کہ کوئی پرندہ اندر نہیں جا سکتا۔پھل نہ ہو تو کناروں پر لگے سٹیل کے پائپوں سے لپیٹ دیا جاتا ہے۔غرض ہر کام میں رات دن محنت کرتے ہیں اور کام سے ہی زندگی بھر کام رکھتے ہیں۔

ایک مشہور شہر نکو ہے جسے ہر وہ آدمی جو جاپان جائے، دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔اس میں مختلف بت بڑی ہیبت ناک شکلوں والے، اور خوبصورت مناظر کے ساتھ مختلف مندر وغیرہ بھی ہیں۔ایک شاہی مندر ہے جس میں ایک بار بادشاہ جاتا ہے اور چاروں کونوں میں پہلے بادشاہوں کی روحوں کو مخاطب کر کے ملکی وقومی حالات بیان کرتا ہے۔ضرورت ہو تو مدد کی درخواست بھی کر سکتا ہے، ورنہ سال بعد یہ موقع آئے گا۔ایک دوست بتا رہے تھے کہ یہ حکمران دراصل کوریائی نسل کے ہیں، مگر جاپانی یہ نہیں مانتے، کہ کوریا والوں کو اپنے سے بہت کمتر جانتے ہیں۔ایک وادی ہے جس میں بہت سے بادشاہ دفن ہیں، ادھر جانے کی اجازت نہیں۔ایک بار ایک غار سا کھل گیا، جس میں بچے کھیلتے رہتے تھے۔ایک روز وہ اندر چلے گئے تو اندر خوبصورت کمرے تھے اور نقش ونگار بنے تھے۔انسانی ہڈیاں پڑی تھیں

چنانچہ وہ والد کو لے کر آ گئے۔ یوں اس نے لوگوں کو بتایا تو پتا چلا کسی بہت پرانے بادشاہ کی قبر ہے۔ اس میں تصویریں اور نقش و نگار ایسے تھے جیسے کوریا کے حکمرانوں کے مقابر میں ملتے ہیں۔ پھر وہ حکومت نے بند کر دیا اور اب بادشاہ دیوی کی اولاد کہلاتے ہیں۔ جاپان کی فوج بھی اسی لیے بہت جانباز تھی کہ انہیں محض فوجی امور سے تعلق تھا، اس کے علاوہ کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ نیز مر کر انہیں بھی اگلی زندگی کا تصور ہے، مگر وہاں نجات بادشاہ نے دینی ہے لہٰذا شاہی حکم پر جان دینا ہی بہت بڑی سعادت ہے۔ اور ویسے بھی وہ جان دینے سے گھبراتے نہیں، بلکہ خودکشی کر لینا بھی بہت سے مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے اور بڑے شاندار طریقے سے کی جاتی ہے۔ خاص قسم کے دیئے جلا کر خوشبو وغیرہ کی دھونی لگا کر، دو زانو بیٹھ کر تیز خنجر پیٹ میں اور سینے کے درمیان گھونپ دیا جاتا ہے جسے خود اپنے دونوں ہاتھ میں پکڑ کر خودکشی کرنے والا مارتا ہے۔ واقعی یہ مشینی انسان یا انسانی مشین، عجیب لوگ ہیں اور دُنیا سے ان کی راہ الگ ہے۔ ایک جاپانی خاتون ملاقات کو آئی جس نے تصوف پڑھ تو بہت رکھا تھا عملاً تربیت کی طالب تھی اور ہنوز مسلمان نہ تھی۔ کافی باتیں ہوئیں، پھر ذکر سیکھ کر چلی گئی۔ اللہ کرے! اس کا دل روشن ہو اور اسے ایمان نصیب ہو جائے۔ یوں ہم مسلسل دس روز جاپان میں شب و روز مصروف رہے اور چار پانچ شہروں میں احباب کو اللہ کا ذکر کرنا سکھایا۔ اللہ کریم قبول فرمائیں۔ اور 10- فروری کو علی الصبح ذکر اور نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور ایئرپورٹ کو چلے۔ ڈیڑھ گھنٹہ ڈرائیونگ کا وقت ہے، پھر روڈ بلاک کا خطرہ الگ، مگر ہم بروقت پہنچ گئے۔ حسبِ معمول بہت ہی بھیڑ تھی مگر کوئی شور نہ تھا۔ یہ وہی ہوائی اڈہ تھا جہاں دس روز پہلے ہم وارد ہوئے تھے۔ وہی بھیڑ بھاڑ اور رونق تھی مگر سب لوگ یا جانے والے تھے اور یا آنے والے، یعنی سب کے سب مسافر تھے۔ یہاں نہ کوئی کسی کو چھوڑنے آتا، ہے نہ لینے۔ ایک پاکستانی خاتون اسلام آباد اپنی امی سے ملنے جا رہی تھی مگر ساتھ کوئی چھوڑنے نہ آیا تھا اور نہ یہاں کسی کے پاس فرصت ہوتی ہے۔ بکنگ پر اس کا سامان زیادہ نکل آیا تو انہوں نے پہاڑ جتنی رقم مانگ لی۔ وہ پریشان سی ہو کر ہمارے پاس آئی تو ہم نے

دو وزنی بیگ اپنے ساتھ رکھ لیے جو اسے اسلام آباد آ کر دیئے۔ یوں ہم جاپان کی زندگی کو ایک طائرانہ نظر سے دیکھ سکے۔ شاید جو دیکھا، وہ سب تو آپ کو سنا بھی نہ سکے اور PIA کی ایئر بس ہمیں لے کر چین کی طرف محوِ پرواز ہوگئی۔ فضا سے بھی زمین کا کوئی چپہ خالی نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ پہاڑوں تک کو برف نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کثرت کارخانوں کی تھی جو جگہ بچی وہاں زراعت۔ بڑے جزیرے کے ساتھ دُور دُور تک خوبصورت جزیرے تھے، جن پر ویسی خوبصورت آبادیاں نظر آتی تھیں۔ اور سمندروں میں ہر طرف چھوٹے جہاز تتلیوں کی طرح لگتے تھے۔ آہستہ آہستہ جاپان دُور ہوتا گیا اور آخر ایک جگہ اعلان ہوا کہ ہم ییلوسی (Yellow Sea) یعنی پیلے سمندر پر پرواز کر رہے ہیں۔ یہ پیلے سمندر چینی دریاؤں نے بنا رکھے ہیں۔ چین کے سب دریا بہت زیادہ مٹی لاتے ہیں اور پیلے رنگ کا پانی ہوتا ہے جس نے سمندر کے ایک وسیع علاقے کو پیلا کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ جہاز چین کی طرف بڑھ رہا تھا حتیٰ کہ ساحل نظر آنے لگا۔ چین کی سرزمین اور گاؤں نظر آ رہے تھے۔ چین اگرچہ بہت وسیع ملک ہے مگر آبادی بھی اسی نسبت سے ہے اور ہر چند کھیتوں کے بعد گاؤں ہے۔ جہاز چونکہ نیچے نیچے جا رہا تھا، لہٰذا گاؤں پر سے دھند لکے صاف ہو رہے تھے اور آخر گاؤں نظر آنے لگے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھوٹے چھوٹے گھر ایک ہی قسم کے اور ایک ہی طرز کے۔ آدمی چاہے تو ان کو ٹھٹریوں کی مثال دے سکتے ہیں جو بھٹے والے ٹھیکیدار مزدوروں کے لیے بناتے ہیں۔ بالکل ایسی ہی طرز کے سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے، نہایت یکساں، نہ دارا، نہ بیٹھک، نہ چودھریوں کی چوپال، نہ خانوں کا حجرہ، اور نہ ملکوں کی مسیت، نہ کوئی بیٹھک، نہ حجرہ اور نہ معبد۔ حتیٰ کہ بیجنگ کے ہوائی اڈہ پہ جہاز اتر گیا۔ شہر خوبصورت لگتا تھا۔ بلند و بالا عمارتیں بھی تھیں مگر شہر سے باہر کوئی ٹریفک دکھائی نہ دی، اکا دکا گاڑی نظر آتی تھی، وہ بھی پبلک بس قسم کی۔ ہوائی اڈہ کافی فاصلے پر ہے۔ وہاں عصر کی نماز ادا کی۔ ہر طرف ویرانی سی پڑی تھی اگرچہ باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ چین کے لوگ جو اندر آئے ان میں آفیسر بھی تھے مگر وہی سرکاری ڈھیلی ڈھالی وردی جو انہیں ملتی ہے۔

ہمارے ہاں تو سپاہی فٹ کروا کر پہنتا ہے۔ جہاز کی صفائی کرنے والا سارا عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ بہر حال اندازہ یہی ہے، ورنہ لباس قد و قامت اور جسامت وجامت سب کی ایک جیسی تھی۔ کہ جو گاڑی کھانا لوڈ کرنے آئی اس کے ملازمین کو ہم مرد سمجھ رہے تھے، بس یہ ہمارا اندازہ تھا۔ گھنٹہ بھر رک کر جہاز میاں اُڑ گئے اور ہم دل ہی دل میں ہمالہ کی چوٹیوں اور وادیوں کے دیدار کا شوق لیے بیٹھے تھے۔ جہاز بیجنگ سے اُڑا تو شمال مغرب کو ہولیا۔ درجہ حرارت تو بیجنگ میں چار تھا، جیسے ہی جہاز اُڑا تو پہاڑی علاقے شروع ہو گئے اور زمین پر جے ہوئے پانی ایسے لگتے جیسے کھیتوں میں کلر ہو، مگر تھوڑی دیر بعد منجمد ندی نالے نظر آنے لگے اور آہستہ آہستہ برف پہاڑوں پر دکھائی دینے لگی۔ ایک بہت لمبا دریا جم کر چاندی ہو گیا تھا۔ ایک وسیع جھیل ڈوبتے ہوئے سورج میں، لگتی تھی جیسے کسی نے بہت بڑی چاندی بچھا دی ہو۔ آہستہ آہستہ تاریکی اپنا دامن پھیلانے لگی مگر جہاز ایک خاص علاقے پر سے گزرتے ہوئے وہاں کے نظارے دکھا رہا تھا۔ عجب بہار تھی، پہاڑوں پر برف شفق کے رنگوں میں آتش بازی کے منظر پیش کر رہی تھی اور نیچے وادیاں سبز درختوں سے بھری تھیں۔ غالباً سردیوں کے پھل دار درخت لگے تھے اور یہ حسنِ فطرت کی آخری جھلک تھی جس نے آنکھوں کی راہ دل تک خوبصورت احساسات کی بارش کر دی تھی اور پھر فطرت نے لجاتے شرماتے ہوئے شفق تک کے رنگوں کو بادلوں تلے ڈھانپ دیا، اور آخر رات کے دبیز پردے ہر شئے پر چھا گئے۔ جہاز بہت دور تک جا کر پھر جنوب مشرق کو مڑا اور خنجراب پر سے داخل ہو کر پاکستان میں ہمالہ کے سلسلوں پر سے ہوتا ہوا اسلام آباد آ پہنچا اور ہم ہمالہ کی خوبصورت چوٹیوں اور گہری وادیوں پر سے بغیر انہیں دیکھے گزر گئے۔ ہاں! مگر اللہ کریم کا ایک بہت بڑا احسان رہا کہ ذکر کے سوتے بہتے رہے۔ جاپان سے ساتھ چلنے والے PIA کے انجینئر صاحب نے جہاز میں بیعت کی، ذکر کرنا سیکھا۔ اور ایئر ہوسٹس نے جو ساتھ تھی اس نے بھی ذکر سیکھا، اور پھر بیجنگ سے بدلنے والے عملے کی ایئر ہوسٹس نے اسلام آباد آنے سے پہلے ذکر سیکھ لیا۔ یوں ہمالہ کی بلند اور سرد فضاؤں میں بھی انوارات الٰہی بٹتے

رہے، لٹتے رہے اور اللہ کے بندے دلوں کو یادِ الٰہی سے آراستہ کرتے رہے۔
اللہ کریم اپنی یاد کے ان بہتے چشموں کو ہمیشہ رواں دواں رکھے اور انہی کے کنارے موت بھی آ کر گلے سے لگا لے۔ ہم نہ ہوں مگر یہ ذکرِ الٰہی کے زمزمے گونجتے رہیں ... آمین ثمّ آمین ...

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلۂ العالی

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو وڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراسن سکیں۔ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ اپلیکیشن بھی موجود ہے

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ اپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائیٹ اور اپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

1- مفسّر، مترجّم و مفکّرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2- مشکوۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔ 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہی آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ 4- اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبد الباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔ 5- حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6- ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8- اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔ 9- سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریبا تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فورا اپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ 03235205255

فہرست کتب

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

اسرار القلوب	شرح مسائل السلوک	شرح دلائل السلوک
لطیفہ قلب ذریعہ علم	تصوف کیا ہے؟	بیعت کیا ہے؟
محافل شیخ	لطائف اور تزکیہ نفس	طبیب دل تلاش کرو
کنوزِ دل	درود وسلام	رموزِ دل
کنز الطالبین	دیدہ تر	سوچ سمندر
گردِ سفر	نشان منزل	کون سی ایسی بات ہوئی ہے
متاع فقیر	آس جزیرہ	خطابات امیر

Phone: +92543562200, Fax: +92543562198
E-mail: darulirfan@gmail.com
Web site:www.oursheikh.com